دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۲ ماہ رمضان المبارک ۱۴۳۴ھ مطابق ماہ جولائی ۲۰۱۳ء عدد ۱

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

استانبول کا پرانا نام قسطنطنیہ ہے۔ اسے ۲۹ مئی ۱۴۵۳ میں سلطان محمد نے فتح کیا اور اسی نسبت سے فاتح کہلایا۔ یہ شہر کئی بڑی حکومتوں کا پایہ تخت رہا ہے۔ ۱۹۲۳ میں خلافت کے اختتام تک یہ عثمانیوں کا دار الخلافہ رہا۔ عظیم الشان مسجدوں کے خوبصورت اور فلک بوس منارے اس کی شناخت رہے ہیں۔ اس شہر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ یوروپ اور ایشیا دونوں براعظموں پر آباد ہے۔ بیچ میں آبنائے باسفورس ہے۔ اس کے یوروپی حصہ کے سب سے ثروت منداور اہم علاقہ کو تقسیم اسکوائر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بڑے بڑے ہوٹل، شاپنگ مال اور دوسری سہولیات کی وجہ سے اسے استانبول کے قلب کی حیثیت حاصل ہے۔ عثمانی عہد میں اس علاقہ میں توپ خانہ کی بیرک تھی جو خلیل پاشا توپ خانہ بیرک کے نام سے مشہور تھی۔ سقوط خلافت کے بعد اس کو منہدم کر کے یہاں ایک بڑا پارک بنا دیا گیا۔ اس علاقہ میں جب بڑے بڑے ہوٹل اور شاپنگ مال بننے شروع ہوئے تو اس کا رقبہ سکڑتا چلا گیا اور اب یہ ایک چھوٹا سا پارک ہے اور عام طور سے اسے گیزی پارک کے نام سے جانا جاتا ہے۔ گذشتہ دنوں حکومت نے اسی جگہ تاریخی بیرک کے نقش ثانی کی تعمیر کا پروگرام بنایا۔ اس کے نچلے حصہ میں میوزیم یا شاپنگ مال بنانے کا منصوبہ ہے۔ اس منصوبہ کے خلاف ماحولیات سے دلچسپی رکھنے والے کچھ افراد نے ۲۸ مئی کو اس پارک میں مظاہرہ کیا۔ ان کو وہاں سے ہٹانے کے لیے پولس نے طاقت کا استعمال کیا۔ اس کی وجہ سے مظاہرے شدت اختیار کر گئے اور استانبول سے باہر بھی کئی شہروں میں پھیل گئے۔ یہ سلسلہ تین ہفتوں تک چلتا رہا۔

عالمی میڈیا نے ان مظاہروں کی خوب تشہیر کی۔ امریکہ اور یوروپ کی کئی حکومتوں نے ان مظاہروں کو دبانے کے لیے غیر متناسب طاقت کے استعمال کا الزام لگایا۔ عالمی میڈیا نے اسے بہار عرب کی توسیع قرار دیا اور اسے بہار ترکی کا نام دیا۔ تقسیم اسکوائر کو ترکی کا تحریر اسکوائر قرار دیا گیا اور ان مظاہروں کو ایک نئے انقلاب کا نقطہ آغاز بتایا گیا۔ بہار عرب شخصی آمریت، وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے کرپشن، بدعنوانی، ظلم و جبر، غربت و افلاس اور سیاسی عمل سے عوام کی یکسر بے دخلی کی کوکھ سے پیدا ہوئی تھی۔ ترکی کی صورت حال ان ممالک سے یکسر مختلف ہے۔ ترکی میں ایک منتخب حکومت برسر اقتدار ہے جس نے تین مسلسل الیکشن جیتنے کا ریکارڈ قائم کیا ہے اور ہر الیکشن میں اس کے حلقہ اثر میں اضافہ ہوا ہے۔ آخری الیکشن میں اس نے پچاس فیصد ووٹ حاصل کیے۔ ان مظاہروں کے دوران اور بعد میں بھی جو جلسے وزیر اعظم کی حمایت میں ہوئے ان سے واضح ہو گیا ہے

کہ ان مظاہروں کی وجہ سے حکومت کی مقبولیت پر کوئی منفی اثر نہیں پڑا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ترکی میں جمہوریت کے استحکام کا پورا کریڈٹ موجودہ حکومت کو جاتا ہے۔ جمہوریت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ فوج تھی جو اپنے آپ کو کمالی ورثہ کی خودساختہ امین اور محافظ تصور کرتی تھی۔ موجودہ حکومت کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ملک کو جمہوریت کے سر پر لٹکنے والی اس تلوار سے نجات دلا دی۔ اس کے علاوہ گذشتہ دس برسوں کی قلیل مدت میں وزیراعظم رجب طیب اردگان کی قیادت میں ترکی نے معاشی میدان میں ناقابل یقین ترقی کی ہے جس کی وجہ سے ملک عدیم المثال خوش حالی سے بہرہ ور ہو چکا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب پڑوسی یوروپی ممالک بدترین کساد بازاری کے شکار تھے، ترکی نے نہ صرف اپنی معاشی ترقی کی رفتار کو برقرار رکھا بلکہ ۵۱ سال سے چلے آرہے آئی ایم ایف کے بھاری قرضے سے نجات حاصل کرلی۔ اس قرض کی آخری قسط ان ہنگاموں سے چند دن پہلے مئی میں ادا کردی گئی۔ افراط زر کی شرح ۳۰ فی صد سے گھٹ کر ۶ فی صد رہ گئی جو ان حالات میں ایک معاشی عجوبہ سے کم نہیں۔ موجودہ حکومت کے اقتدار میں آنے سے پہلے سنٹرل بینک کے پاس صرف ستائیس بلین ڈالر کا ریزرو تھا جو اب ۱۳۵ بلین ڈالر تک پہنچ چکا ہے۔ اس سلسلہ میں خاص بات یہ ہے کہ اس خوش حالی کی برکات عام باشندگان ملک تک پہنچ رہی ہیں جب کہ پہلے یہ صرف ایلیٹ کلاس تک محدود تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مظاہرے صرف اس لیے ممکن ہوسکے ہیں کہ گذشتہ دس برسوں میں ترکی میں جمہوریت مستحکم ہوچکی ہے۔ اس سے پہلے حکومت کے خلاف کسی مظاہرے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس مظاہرہ کی ابتدا تو ان لوگوں نے کی جو ماحولیاتی اسباب کی وجہ سے پارک کے انہدام کے خلاف تھے لیکن ان کی تعداد خاصی مختصر تھی۔ بعد میں جو لوگ اس میں شامل ہوئے اور اس کی تنظیم میں اہم کردار ادا کیا ان کی غالب اکثریت حزب اختلاف (CHP) سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ کمالی ورثہ کے حاملین، قوم پرست، کمیونسٹ اور بعض دوسرے انتہا پسند عناصر بھی ان میں شامل تھے۔ ان کے الگ الگ اغراض و مقاصد تھے۔ اس دوران جو نعرے لگائے جارہے تھے ان میں وزیراعظم کے استعفاء کے مطالبہ کے علاوہ شراب کی خرید وفروخت کے اوقات کی تحدید کے خلاف نعرے اور ''ہم مصطفیٰ کمال کے سپاہی ہیں'' جیسے نعرے شامل تھے۔ اگر پوری صورت حال کا گہرائی سے تجزیہ کیا جائے تو واضح طور پر یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ اس وقت ترکی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ترکی کے قومی تشخص کے عناصر ترکیبی کیا ہوں۔ ترکی کو صدیوں عالم اسلام کے مرکز خلافت ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ ترکوں نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے اور اس میدان میں بڑی عظیم الشان اور روشن روایتیں قائم کی ہیں۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی کے اس قومی تشخص کو یکسر

بدل ڈالا اور اس کو مذہب بیزاری کے راستہ پر ڈال دیا۔ مصطفیٰ کمال پاشا کے بعد ان کے پیرووں بالخصوص فوج نے اس نامسعود وراثت کی بھرپور حفاظت کی۔ موجودہ حکومت نے جب ترک عوام کی غالب اکثریت کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے مذہب کی طرف واپسی کا محتاط سفر شروع کیا تو اسے ترکوں کے لائف اسٹائل کو بدلنے کا ملزم قرار دیا جا رہا ہے۔ وہ طبقات جن کے نظریاتی اجداد نے بیک جنبش قلم پوری قوم کے لائف اسٹائل کو بدل کے رکھ دیا اور ان کو ان کی روشن تاریخ اور عظیم روایات سے کاٹ دیا وہ اب حکومت پر ترکوں کے لائف اسٹائل بدلنے کا الزام لگا رہے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ چھوٹا سا مغرب نواز، تعلیم یافتہ، شہری ایلیٹ طبقہ گذشتہ تقریباً ایک صدی سے ہر طرح کی مراعات کا عادی رہا ہے۔ فوج، بیوروکریسی اور عدلیہ ان کے مفادات کی حفاظت کرتی تھیں۔ یہ لوگ ان حقوق سے بہرہ ور تھے جن سے ترکوں کی اکثریت ناآشنا تھی۔ یہ طبقہ ان مخصوص مراعات، حقوق اور اختیار و اقتدار کا اس حد تک عادی ہو گیا کہ اس کے بغیر ان کے لیے زندگی کا تصور بھی مشکل ہے۔ چنانچہ موقع ملتے ہی انہوں نے اپنے غم و غصہ کا بھرپور اظہار کیا۔ بھیڑ میں شامل بعض عناصر کی طرف سے توڑ پھوڑ اور لوٹ مار کے واقعات کے پس منظر میں حکومت نے ان مظاہروں کے لیے بیرونی طاقتوں کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ خطہ اور عالم اسلام بالخصوص فلسطین کے وسیع تر تناظر میں ترکی کی خارجہ پالیسی اور اس کے نتیجہ میں ترکی کے بڑھتے ہوئے اثرات کو کئی حکومتیں پسند نہیں کرتیں۔ ترک حکومت نے گذشتہ دنوں بڑی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک زمانے سے الجھے ہوئے کرد مسئلہ کے پرامن حل کی طرف ایک بڑی پیش رفت کی ہے۔ یہ بات بھی کچھ مخصوص حلقوں کو پسند نہیں۔ اگر ان طاقتوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ترکی کو غیر مستحکم کرنے کی کوشش کی ہو تو اسے بعید از قیاس قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان سب کے باوجود یہ بھی واقعہ ہے کہ مظاہروں کو دبانے کے لیے حکومت نے جو طریقہ اختیار کیا وہ مناسب نہیں تھا۔ جمہوریت میں مخالفین کی بات بھی سنی جاتی ہے۔ کوئی بھی حکومت صرف ان لوگوں کی نمائندگی نہیں کرتی جو اسے ووٹ دیتے ہیں۔ اپنے ہی عوام کے خلاف طاقت کا استعمال اچھے نتائج نہیں پیدا کرتا۔ عدل و انصاف کے تقاضوں کی پاسداری ہر حال میں ضروری ہے۔ اب جب کہ ہنگاموں کی گرد بہت حد تک بیٹھ چکی ہے اور حالات معمول پر واپس آ چکے ہیں امید کی جانی چاہیے کہ پوری صورت حال کا گہرائی اور سنجیدگی سے تجزیہ کیا جائے گا اور اس سلسلہ میں در آنے والی کمیوں کی تلافی کی کوشش کی جائے گی۔ اس سے جمہوریت مضبوط ہوگی۔ گذشتہ کچھ عرصہ سے عالم اسلام کے لیے ترکی ایک ماڈل کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ اس کی اس حیثیت کو باقی رکھا جانا چاہیے۔

مقالات

حبط اعمال
عوامل ومحرکات......قرآن کی روشنی میں

ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس

قرآن کریم نے عربی زبان وادب کو بقا کے ساتھ نئی جہتیں بھی عطا کیں۔الفاظ جو مدتوں سے مستعمل تھے ان کو نئے معانی کا جامہ پہنایا اور ان ہی الفاظ کو قرآنی ادب نے اصطلاحات بنا کر پیش کیا۔یہی وجہ ہے کہ اہل عرب بھی قرآن فہمی کے لیے نبی کریمؐ کے عمل اور تشریحات کے محتاج تھے۔قرآن ایک ہی لفظ کو سیاق وسباق کے حوالہ سے مختلف معانی میں استعمال کرتا ہے بصائر ذوی التمییز اور زادالمسیر میں اس نقطہ نظر کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

قرآنی اصطلاحات میں سے ایک حبط اعمال ہے ''ح ب ط'' کے مادہ سے بننے والے اس لفظ کی ۱۶ مختلف صورتیں قرآن کریم میں استعمال ہوئی ہیں۔لغوی اعتبار سے یہ لفظ ضائع ہونے، اکارت جانے، کالعدم ہونے، ضبط ہونے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔(۱)

حَبَطَ عَمَلُهُ (۲) کی تعبیر اہل لغت نے بَطَلَ ثوابه اور فَسَدَ وَهَدَرَ سے کی ہے(۳)۔ اس بطلان وضیاع کی مثال کو بصائر میں اس طرح بیان کیا ہے۔ حبط ماء الركية کہا جاتا ہے جب کنویں کا پانی نیچے چلا ایسے کہ کبھی بھی واپس آنے کا نہیں۔ان مفاہیم سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ ''حبط اعمال'' سے اعمال کی تاثیر ختم ہو کر رہ جاتی ہے جیسے اعمال کا وجود تھا ہی نہیں۔

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

''صارت اعمالهم الحسنة التي عملوها في حالة الاسلام فاسدة بمنزلة مالم تكن'' ۔(۴)

چیئرمین شعبہ علوم اسلامیہ جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد۔

علامہ طبرسی نے لکھا:

"وانما تحبط الطاعة حتی تصیر کانها لم تفعل" ۔(۵)

عمل کا ضائع ہونا دو وجہ سے ہوسکتا ہے:

ا۔ جو چیز انسان کے اعمال کو قدر و منزلت عطا کرتی ہے وہ اس کا ارادہ وقصد ہے۔ اگر اعمال لوجہ اللہ نہیں ہوئے تو وہ اپنے تمام تر حسن و جمال اور اہتمام کے باوجود حبط ہو جائیں گے۔ درج ذیل حدیث مبارکہ حبط کی اس کیفیت کو ظاہر کرتی ہے۔

ان اول الناس یقضی علیه یوم القیامة رجل استشهد فاتی به فعرفه نعمته فعرفها فقال فما عملت فیها ؟ قال قاتلت فیک حتی استشهدت قال کذبت ولکنک قاتلت لان یقال جریٌ فقد قیل ثم امر به فجحب علی وجهه حتی القی فی النار ورجل تعلم العلم وعلمه وقرأ القران ، فاتی به فعرفه نعمته فعرفها قال فما عملت فیها ؟ قال تعلمت العلم وعلمته وقرأت فیک القران قال کذبت ولکنک تعلمت العلم لیقال انک عالم و قرأت القران لیقال هو قاری فقد قیل ، ثم امر به فسحب علی وجهه

ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں، رسول اللہؐ نے فرمایا" روز قیامت سب سے پہلے شہید کا فیصلہ سنایا جائے گا۔ اسے پیش کیا جائے گا، تو اللہ اسے اپنی نعمتیں یاد کرائے گا اور وہ ان کا اعتراف کرے گا، پھر اللہ فرمائے گا: تو نے ان کے بدلے میں (شکر کے طور پر) کیا کیا؟ وہ عرض کرے گا میں نے تیری خاطر جہاد کیا حتی کہ مجھے شہید کر دیا گیا، اللہ فرمائے گا: تو نے جھوٹ کہا، بلکہ (سچ یہ ہے کہ) تو نے اس لیے جہاد کیا کہ بہادر کہا جائے، پس وہ کہہ دیا گیا۔ پھر اس کے متعلق حکم دیا جائے گا تو اسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ دوسرا شخص جس نے علم حاصل کیا اور اسے دوسروں کو سکھایا اور قرآن کریم کی تلاوت کی، اسے بھی پیش کیا جائے گا، تو اللہ اسے اپنی نعمتیں یاد کرائے گا، وہ ان کا اعتراف کرے گا، اللہ پوچھے گا کہ تو نے ان کے بدلے میں کیا کیا؟ وہ عرض کرے گا میں نے علم سیکھا اور اسے دوسروں کو سکھایا اور میں تیری رضا کی خاطر قرآن کی تلاوت کرتا رہا، اللہ فرمائے گا: تو نے

حتی القی فی النار ورجل وسع اللہ علیہ واعطاہ من اصاف المال کلہ فاتی بہ فعرفہ نعمہ فعرفھا قال فما عملت فیھا؟ قال ماترکت من سبیل تحب ان ینفق فیھا الا انفقت فیھا لک قال کذبت ولکنک فعلت لیقال ھو جواد فقد قیل ، ثم امر بہ فسحب علی وجھہ ثم القی فی النار ۔(۶)	جھوٹ کہا، (سچ یہ ہے کہ) تونے علم اس لیے حاصل کیا تھا کہ تجھے عالم کہا جائے اور قرآن پڑھا تا کہ قاری کہا جائے، وہ کہہ دیا گیا، پھراس کے متعلق حکم دیا جائے گا، تو اسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور تیسرا وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے مال وزر کی جملہ اقسام سے خوب نوازا ہوگا، اسے پیش کیا جائے گا، تو اللہ اسے اپنی نعمتیں یاد کرائے گا، وہ انہیں پہچان لے گا، تو اللہ پوچھے گا: تونے ان کے بدلے میں کیا کیا؟ وہ عرض کرے گا میں نے ان تمام مواقع پر جہاں خرچ کرنا تجھے پسند تھا، خرچ کیا، اللہ فرمائے گا: تونے جھوٹ کہا، تونے تو اس لیے خرچ کیا کہ تجھے بڑا سخی کہا جائے، پس وہ کہہ دیا گیا، پھراس کے متعلق حکم دیا جائے گا تو اسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

۲-حبط اعمال کی ایک صورت یہ بھی ہے اعمال صالحہ کیے مگر ساتھ ساتھ گناہ اتنے کیے کہ اعمال صالحہ بے اثر ہوگئے اور گناہوں کا پلڑا بھاری ہوگیا۔ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ (۷) میں اسی طرف اشارہ ہے۔ راغب نے اس مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

"ان تکون اعمالا صالحۃ یکون بازائھا سیئات تزید علیھا وذلک ھو المشار الیہ بخفۃ المیزان" ۔(۸)

حبط کی اس کیفیت کی وضاحت حدیث نبویؐ میں یوں کی گئی ہے:

وعنہ ان رسول اللہ ﷺ قال : (اتدرون ما المفلس؟) قالوا: المفلس فینا من لا درھم لہ ولا متاع ، فقال: (ان المفلس من امتی	ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ انہوں نے عرض کیا جس شخص کے پاس درہم ہوں نہ مال و متاع، آپؐ نے فرمایا: میری امت میں سے مفلس وہ

من یاتی یوم القیامة بصلٰوة و صیام و زکٰوة و یاتی قد شتم هذا ، وقذف هذا ، واکل مال هذا ، وسفک دم هذا ، وضرب هذا ، فیعطی هذا من حسناته وهذا من حسناته ، فان فنیت حسناته قبل ان یقضی ما علیه اخذ من خطایاهم فطرحت علیه ، ثم طرح فی النار۔(۹)

شخص ہے جو روز قیامت نماز ، روزہ اور زکوٰۃ لے کرآئے گا اور وہ بھی آجائے گا جسے اس نے گالی دی ہوگی ، جس کسی پر بہتان لگایا ہوگا ، جس کسی کا مال کھایا ہوگا ، جس کسی کا خون بہایا ہوگا اور جس کسی کو مارا پیٹا ہوگا ، اس (مظلوم) کو اس کی نیکیوں میں سے نیکیاں دے دی جائیں گی اور اگر اس کے ذمے حقوق کی ادائیگی سے پہلے ہی اس کی نیکیاں ختم ہوگئیں تو ان (حق داروں) کے گناہ لے کر اس شخص پر ڈال دیے جائیں گے پھر اسے دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔

انگریزی میں حبط کے لیے Perish, Fruitless, Vain کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں(۱۰) جبکہ قرآن کریم میں حبط کے مترادف کے طور پر بطل ، ضاع کے الفاظ ہیں۔

حبط اعمال کے عوامل ومحرکات: قرآن کریم میں اس لفظ کے استعمالات پرغور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ حبط اعمال دراصل بعض انسانی اعمال کا نتیجہ ہے یعنی بعض برے اعمال انسانی زندگی پر اس طرح اثر انداز ہوتے ہیں کہ وہ اعمال صالحہ کی تاثیرات کو معدوم کردیتے ہیں اور انسان کو اس کا شعور بھی نہیں ہوتا۔

ذیل میں آیات قرآنی کی روشنی میں بعض ایسے اعمال کا ذکر کیا جاتا ہے جو ''حبط اعمال'' کا سبب بنتے ہیں:

۱-شرک: ذات وصفات الٰہی میں خالق کائنات کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اعمال حسنہ کو ضائع کردیتا ہے اور یہ ظلم عظیم ہی نہیں بلکہ اس ظلم کے نتیجہ میں اعمال صالحہ غارت ہوجاتے ہیں قرآن کریم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شرک کی بیماری پچھلی قوموں میں بھی حبط اعمال کا سبب بنا کرتی تھی۔

وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْکَ وَاِلَی الَّذِیْنَ بے شک وحی کی گئی آپؐ پر اور ان کی طرف جو آپؐ

مِنْ قَبْلِکَ لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ وَ لَتَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۔ (الزمر:۶۵)	سے پہلے تھے کہ اگر (بفرض محال) آپؐ نے (بھی) شرک کیا تو ضائع ہوجائیں آپؐ کے اعمال اور آپؐ (بھی) خاسرین میں سے ہوجائیں گے۔

اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہ ان لوگوں کو جواب دیا ہے اور چونکہ ان کی بات بالکل جاہلوں کی بات تھی اس وجہ سے ان کو خطاب نہیں کیا بلکہ اپنے پیغمبر کو خطاب کر کے ان کو بات سنادی۔فرمایا کہ یہ جاہل لوگ تم سے شرک کے لیے ضد کر رہے ہیں حالانکہ تمہاری طرف بھی اور تم سے پہلے بھی جو نبی و رسول گذرے ہیں ان سب کی طرف یہ وحی ہوچکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے عمل حبط ہوجائیں گے اور تم نامرادوں میں سے ہوکر رہ جاؤ گے۔فلاح کی راہ صرف یہ ہے کہ اللہ ہی کی بندگی کرو اور اس کے شکر گزار بندوں سے بنو، حبط عمل سے مراد یہ ہے کہ شرک کے ساتھ جو عمل اللہ کے لیے بھی کیے جاتے ہیں وہ بھی سب ضائع اور لاحاصل ہوکر رہ جاتے ہیں ۔اللہ تعالیٰ کسی مشرک کے عمل کو قبول نہیں فرماتا۔وہ صرف اپنے ان بندوں کی نیکیاں قبول فرماتا ہے جو کسی کو اس کا شریک نہیں بناتے''۔

ارتداد: جو مسلمان اپنا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرلیتا ہے اس کی ساری نیکیاں اکارت و غارت جاتی ہیں ۔جیسے ہی آدمی نے دین تبدیل کیا ویسے ہی اس کے اعمال حسنہ کی خاصیت بدل جاتی ہے۔کفار کی آرزو کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے کہا:

وَلَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ حَتّٰی یَرُدُّوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا وَمَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَیَمُتْ وَھُوَ کَافِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ۔	اور وہ (کافر) تم سے ہمیشہ جنگ کرتے رہیں گے حتی کہ اگر ان کے بس میں ہوتو وہ تمہیں دین سے پھیر دیں اور تم میں سے جو شخص اپنے دین سے مرتد ہوگیا اور وہ حالت کفر میں مرگیا تو ان لوگوں کے (نیک) اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہوگئے اور وہ لوگ جہنمی ہیں جس میں وہ

ہمیشہ رہیں گے۔

اس آیت کی توضیح وتشریح میں ائمہ کا قدرے اختلاف ہے۔امام شافعیؒ کے نزدیک ارتداد پر موت سے نیک عمل ضائع ہوتے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ارتداد ہی سے نیک عمل ضائع ہوتے ہیں۔

نفاق: ذوالوجہین ہونا انسانیت کے نام پر بدترین داغ ہے۔ایسا انسان معاشرہ میں اپنا اعتبار واعتماد کھو بیٹھتا ہے اور انسانوں میں قابل مذمت ونفرت سمجھا جاتا ہے۔یہی دورخا رویہ جب دین کے نام پر اپناتا ہے حبط اعمال کے نتیجہ میں اسفل السافلین کا مقام اس کا مقدر بنتا ہے۔منافقین کی یہ روش اس حقیقت کو آشکارا کرتی ہے، وہ ظاہری، وقتی اور عارضی مفادات کے درپے رہتے ہیں اس طرز عمل سے وہ ایسے کام کر گذرتے ہیں جن کا نتیجہ حبط اعمال کی صورت میں ان کو بھگتنا پڑتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۔ (التوبہ:۶۹)

(اے منافقو) تمہاری حالت بھی ایسی ہے جیسے ان لوگوں کی جو تم سے پہلے گذرے وہ تم سے قوت میں، مال اور اولاد کی کثرت میں تم سے زیادہ تھے سو انہوں نے لطف اٹھایا اپنے دنیوی حصہ سے اور تم نے بھی لطف اٹھایا اپنے (دنیوی) حصہ سے اسی طرح جیسے لطف اٹھایا انہوں نے جو تم سے پہلے ہو گذرے اور (لذتوں میں) تم بھی ڈوبے رہے جیسے وہ ڈوب رہے تھے۔یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال ضائع ہو گئے۔دنیا اور آخرت میں۔

سورہ احزاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ منافقین کا چونکہ حقیقی ایمان ہوتا ہی نہیں اس لیے ظاہری طور پر جو اعمال حسنہ کرتے ہیں وہ عدم ایمان کے سبب باطل ہو جاتے ہیں۔

اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ یہ تمہارے بارے میں بڑا بخل رکھتے ہیں پھر

رَاَیۡتَھُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَیۡکَ تَدُوۡرُ اَعۡیُنُھُمۡ کَالَّذِیۡ یُغۡشٰی عَلَیۡہِ مِنَ الۡمَوۡتِ فَاِذَا ذَھَبَ الۡخَوۡفُ سَلَقُوۡکُمۡ بِاَلۡسِنَۃٍ حِدَادٍ اَشِحَّۃً عَلَی الۡخَیۡرِ اُولٰٓئِکَ لَمۡ یُؤۡمِنُوۡا فَاَحۡبَطَ اللّٰہُ اَعۡمَالَھُمۡ وَکَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرًا ۔

(الاحزاب:۱۹)

جب ان پر خوف طاری ہوتا ہے تو آپ انہیں دیکھیں گے کہ آپ کی جانب یوں دیکھتے ہیں جیسے ان کی آنکھیں اس طرح پھر رہی ہوں جیسے اس شخص کی جس پر موت کے وقت غشی طاری ہوجائے تو جب خوف چلا جاتا ہے تو تمہارے بارے میں بڑی تیز زبانوں سے تلخ باتیں کہتے ہیں اور خیر و برکت کے معاملات میں بڑے بخیل ہوتے ہیں یہ لوگ ایمان ہی نہیں لائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے سارے اعمال کو ضائع کردیا اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے لیے بڑی آسان ہے۔

قتل انبیاء: جب عمل کرنے والے میں خوبی نہیں ہوتی تو عمل کی خوبی بھی ختم ہوجاتی ہے۔ قتل انبیاء علیہم السلام کے مرتکب افراد کا تعلق بھی اسی گروہ سے ہے۔

یہود کو اپنے اعمال اور نسب پر بڑا فخر تھا۔ مگر ان کے تین شدید قبیح افعال کا ذکر کر کے انہیں عذاب الیم کی خبر دی گئی اور اس کی وجہ بھی حبط عمل کے الفاظ میں بتادی گئی۔ یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ یہ سزا صرف یہود کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ان تمام اقوام کے لیے ہے جو ایسے افعال کی مرتکب ہوتی ہیں۔ سورۃ البقرۃ:۶۱ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے ایسے جرائم کا ارتکاب کرنے والوں پر ذلت و افلاس کا عذاب بھی مبتلا کردیا جاتا ہے۔ حبط اعمال کے حوالے سے سورہ آل عمران میں فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَ یَقۡتُلُوۡنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیۡرِ حَقٍّ وَّیَقۡتُلُوۡنَ الَّذِیۡنَ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡقِسۡطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرۡھُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُھُمۡ فِی الدُّنۡیَا

بے شک جو لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو لوگوں میں سے عدل و انصاف کا حکم کرتے ہیں۔ یہ ہیں وہ (بدنصیب) جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے

وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۔ اوران کا کوئی مددگار نہیں۔
(العمران:۲۱-۲۲)

ان دوآیات میں تین قبیح جرائم کا ذکر ہے:

۱-آیات الٰہی کا انکار کرنا۔۲-انبیاءکو ناحق قتل کرنا۔۳-انبیاء ومرسلین کی دعوت وتبلیغ کوآگے بڑھانے والے لوگوں کا قتل۔

ان جرائم کے لیے تین سزاؤں کا اعلان ہوا:

۱-عذاب الیم کی بشارت ۔۲-حبط اعمال-یعنی جو نیک اعمال وہ انجام دے چکے ہیں وہ بھی ان کے گناہوں کی وجہ سے اپنی تاثیر کھو بیٹھے ہیں۔۳-شفاعت سے محرومی۔

آیات الٰہی سے روگردانی اورآخرت کی تکذیب: جولوگ اپنی ضداور ہٹ دھرمی میں اتنے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ انفس وآفاق اور کتاب الٰہی کی آیات کو دیکھنے، جاننے اور پڑھنے کے باوجود اقرار وتسلیم سے بھاگتے ہیں، یقیناً وہ اس بات کے حق دار ہیں کہ ان کے اعمال حبط ہوجائیں۔

ایسے لوگ عملی زندگی میں تکبر اورآخرت کا انکار کرنے والے ہوتے ہیں۔سورۃ الاعراف میں فرمایا گیا:

وَالَّـذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔
(الاعراف:۱۴۷)

اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو اورآخرت کے آنے کو جھٹلایا ان کے سارے اعمال ضائع ہوگئے انہیں وہی بدلہ دیا جائے گا جو وہ عمل کیا کرتے تھے۔

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا مودودی لکھتے ہیں:

''ضائع ہوگئے یعنی بارآور نہ ہوئے غیر مفید اور لاحاصل نکلے اس لیے کہ خدا کے ہاں انسانی سعی وعمل کے بارآور ہونے کا انحصار بالکل دو امور پر ہے ایک یہ کہ وہ سعی وعمل میں دنیا کی بجائے آخرت کی کامیابی پیش نظر رہے۔ یہ دو شرطیں جہاں پوری نہ ہوں گی وہاں لازماً حبط عمل واقع ہوگا۔

جس نے خدا سے ہدایت لیے بغیر بلکہ اس سے منہ موڑ کر باغیانہ

انداز پر دنیا میں کام کیا، ظاہر ہے کہ وہ خدا سے کسی اجر کی توقع رکھنے کا کسی طرح حقدار نہیں ہوسکتا۔ اور جس نے سب کچھ دنیا ہی کے لیے کیا اور آخرت کے لیے کچھ نہ کیا، کھلی بات ہے کہ آخرت میں اسے کوئی ثمرہ پانے کی امید نہ رکھنی چاہیے اور کوئی وجہ نہیں کہ وہاں وہ کسی قسم کا ثمرہ پائے۔

اگر میری مملوکہ زمین میں کوئی شخص میرے منشاء کے خلاف تصرف کرتا رہا ہے تو وہ مجھ سے سزا پانے کے سوا آخر اور کیا پانے کا حقدار ہوسکتا ہے؟ اور اگر اس زمین پر اپنے غاصبانہ قبضہ کے زمانہ میں اس نے سارا کام خود ہی اس ارادہ سے کیا ہو کہ جب تک اصل مالک اس کی جرأت بے جا سے اغماض کر رہا ہے، اسی وقت تک وہ اس سے فائدہ اٹھائے گا اور مالک کے قبضہ میں زمین واپس چلے جانے کے بعد وہ خود بھی کسی فائدے کا متوقع یا طالب نہیں ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ میں اس غاصب سے اپنی زمین واپس لینے کے بعد زمین کی پیداوار میں سے کوئی حصہ خواہ مخواہ اسے دوں''۔

اس آیت سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ حبط اعمال کوئی انتقامی کارروائی نہیں بلکہ یہ تو ان رویوں کا نتیجہ ہے جو کسی نے اپنائے۔

پیغام الٰہی پر عمل نہ کرنے کی صورت میں دنیا میں ذلت و رسوائی اور آخرت میں عذاب الیم کو سورۂ محمد میں ان الفاظ سے بیان کیا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۔ (محمد:۸-۹)	اور جنہوں نے (حق کا) انکار کیا خدا کرے وہ منہ کے بل اوندھے گریں اور اللہ ان کے اعمال کو برباد کر دے۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے ناپسند کیا جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا پس اس نے ضائع کر دیے ان کے اعمال۔

بارگاہ رسالت مآب ﷺ کی بے ادبی: قرآن کریم نے بارگاہ رسالت مآبؐ کے آداب سکھائے، آداب بارگاہ نبویؐ سے چشم پوشی کرنے والوں کو حبط اعمال کی وعید قرآن کے الفاظ

میں ملاحظہ فرمائیں:

يَـاَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ اٰمَـنُـوْا لَا تَـرْفَعُوْٓا اَصْـوَاتَـكُـمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۔ (الحجرات:۲)	اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی کریم کی آوازوں سے نہ بلند کیا کرو اور نہ زور سے آپ سے بات کیا کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہو۔ (اس بے ادبی سے) کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر تک نہ ہو۔

آیت کی وضاحت کرتے ہوئے پیر محمد کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں:

> ''یہاں لام مقدر ہے اور یہ لام عاقبت کے لیے ہے یعنی اگر تم سے آواز اونچا کرنے کی بے ادبی ہوگئی تو اس کا انجام یہ ہوگا کہ تمہارے سارے اعمال برباد ہو جائیں گے۔ اولا اور بالذات یہ خطاب صحابہ کرامؓ کو ہو رہا ہے جن کا ایثار بے نظیر، جن کی قربانیاں بے مثال، جن کی عبادتیں خشوع و خضوع میں ڈوبی ہوئیں تھیں، جو سرتا پا تسلیم و رضا تھے۔ انہیں کہا جا رہا ہے کہ اگر تم نے میرے پیارے رسولؐ کی جناب میں آواز بھی اونچی کی تو یہ ایسی گستاخی تصور ہوگی کہ تمہاری سب نیکیاں ملیا میٹ ہو جائیں گی۔ آج جو لوگ حضورؐ کی شان رفیع میں سوقیانہ باتیں کرتے ہیں ...... ادب و احترام کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ اپنے علم پر، اپنی نیکیوں پر اور اپنے ایمان سوز لمبے لمبے وعظوں پر مغرور ہیں۔ وہ اپنے انجام کے بارے میں خود سوچ لیں''۔

یاد رکھو: ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

رسول اللہ ﷺ کی مخالفت: مسلمان کی نجات کا دار و مدار نبی کریمؐ کی اطاعت و اتباع پر ہے۔ آپؐ کے اسوۂ حسنہ کو چھوڑ کر کہیں اور نجات کی راہیں تلاش کرنے والے کا عمل نتیجہ خیزی سے محروم رہتا ہے۔ قرآن کریم نے امت کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ	بے شک جو لوگ خود بھی کفر کرتے رہے اور لوگوں کو

اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا	بھی اللہ کی راہ سے روکتے رہے اور مخالفت کرتے
تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ	رہے رسول کریمؐ کی باوجودا ینکہ ان پر راہ ہدایت
شَيْئًا وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ۔	ظاہر ہو چکی تھی وہ قطعاً اللہ تعالیٰ کو کچھ ضرر نہیں پہنچا
(محمد:۳۲)	سکتے اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو اکارت کردے گا۔

اس آیت مبارکہ نے اس حقیقت کو ظاہر کردیا کہ اطاعت رسول انسانی مصالح کے تحت نہیں کی جاتی بلکہ اپنی تمام تر مصلحتوں کو مصطفیٰ کریمؐ پر قربان کر کے کی جاتی ہے۔

درج بالا آیات سے ان اعمال کی اجمالی فہرست تیار ہو سکتی ہے جو اعمال کے اثرات کو ضائع ، اکارت اور تباہ و برباد کردیتے ہیں ۔ان آیات اور چند دیگر مقامات کی روشنی میں یہ فہرست اس طرح ہے:

۱-کفر۔ ۲-ارتداد۔ ۳-نفاق۔ ۴-شرک۔ ۵-بارگاہ رسالت کی توہین۔
۶-رسول اللہؐ کی حکم عدولی۔ ۷-تکذیب آخرت۔ ۸-تکذیب آیات الٰہی۔

یہ ان جرائم کی فہرست ہے جن پر حبط اعمال کی وعید سنائی گئی۔

خلاصۂ بحث: حبط اعمال کے محرکات وعوامل کا جائزہ ہمارے اعمال کی حفاظت وصیانت کے لیے انتہائی ضروری ہے، عمل صالح کو انجام دینے کے بعد اس عمل کی حفاظت بھی اہم ترین امر ہے اس حفاظت کے لیے ہمیں ان عوامل کا علم ہونا چاہیے جو اعمال حسنہ کو خطرے میں ڈالتے ہیں یا ان کے اثرات کو نیست ونابود کردیتے ہیں۔ یہ عوامل ظاہر کرتے ہیں کہ عمل کے باطن یا روح کی اہمیت اس کے ظاہر سے زیادہ ہے۔

حبط اعمال کا تذکرہ جن سورتوں میں ہوا وہ تمام مدنی عہد سے تعلق رکھتی ہیں جو ظاہر کرتی ہیں کہ عقیدہ کی پختگی کا مکی عہد گذرا تو مدنی دور میں عقائد کے مظاہر۔''اعمال حسنہ'' کی نگہداشت پر بھی زور دیا جانے لگا۔ مدینہ میں منافقین کے ظہور کے پس منظر میں یہ ضروری تھا کہ مومنین کے اعمال کو ضرر رساں عوامل سے بچایا جائے گویا ان آیات میں مخلصین کے لیے تنبیہ بھی ہے۔مومنین اور منافقین کے اعمال بعض اوقات ظاہراً شکل وصورت میں ایک جیسے ہوتے ہیں مگر اپنے اثرات کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔

قرآنی آیات کا جائزہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ اعمال حسنہ کے اثرات کو زائل کرنے والے عوامل کی انجام دہی سے پہلے بھی موجود ہو سکتے ہیں اور بعض اوقات یہ عمل کے بعد رونما ہوتے ہیں۔

اس مطالعہ سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ حبط اعمال کوئی انتقامی یا ظالمانہ ردعمل نہیں بلکہ اعمال میں انسانی رویوں کا نتیجہ ہے جو عین مبنی بر عدل ہے۔

حوالہ جات/حواشی

(۱) ان مفاہیم کے لیے ملاحظہ فرمایئے:

(i) الفیروز آبادی، مجد الدین محمد بن یعقوب، **القاموس المحیط**، دار الفکر بیروت، ۱۹۷۸، ج ۲، ص ۳۵۳۔ (ii) القیسیسی، مکی بن ابی طالب، **تفسیر المشکل من غریب القرآن**، تحقیق الدکتور علی حسین البواب، مکتبۃ المعارف، الریاض، ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء، ص ۴۰۔ (iii) ابن قتیبہ، عبداللہ بن مسلم، **تفسیر غریب القرآن**، تحقیق السید احمد صفر، مکتبہ توحید وسنۃ پشاور، ۱۹۷۸، ص ۸۲۔ (iv) محمد الجزری، محمد الدین ابی السعادات المبارک، **النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر**، موسسہ مطبوعاتی اسماعیلیان ایران، ۱۳۶۴، ج ۱، ص ۳۳۱۔ (v) ابن منظور افریقی، محمد بن مکرم، **لسان العرب**، دار بیروت، بیروت، ۱۳۸۸ھ/۱۹۶۸ء، ج ۷، ص ۲۶۹ ۲۷۲۔

(۲) قرشی، سید علی اکبر، **قاموس قرآن**، دار الکتب الاسلامیہ، تہران ۱۳۶۴م، ج ۲، ص ۹۶۔ (۳) الفیروز آبادی، مجد الدین محمد بن یعقوب، **بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز**، المکتبۃ العلمیۃ بیروت، ج ۲، ص ۴۲۴۔ (۴) آلوسی، سید محمود، **روح المعانی**، مکتبہ امدادیہ ملتان، ج ۱، ص ۱۱۰۔ (۵) الطبرسی، ابوعلی الفضل بن الحسن، دار مکتبۃ الحیاۃ بیروت ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۱ء، ج ۲، ص ۴۴۔ (۶) **صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب من قاتل للریاء والسمعۃ** ...... رقم ۴۹۲۳۔ (۷) القارعۃ: ۸۔ (۸) الراغب الاصفہانی، **مفردات الفاظ القرآن فی غریب القرآن**، مکتبۃ المرتضویہ، ۱۳۶۲، ص ۱۰۸۔ (۹) **صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم الظلم**، رقم ۶۵۷۹۔ (۱۰) اس کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

(i) Dictionary and Glassary of the Koran by Jhon Penrice.

ایڈز۔قرآن کریم کی روشنی میں

پروفیسر ڈاکٹر محمد شکیل اوج

''اثــمٌ'' کے بنیادی معنوں میں اضمحلال، افسردگی اور توانائی کا کم ہوجانا شامل ہے۔ بایں معنی اعمال صالحہ کی انجام دہی میں بندۂ آثم سُست روی کا شکار نظر آتا ہے۔اسی لیے ابن فارس نے اثم کے معنی دیر ہونے اور پیچھے رہ جانے سے کیے ہیں۔امام راغب کے بقول اثم اور آثام ان افعال کو کہتے ہیں جو ثواب (یعنی اچھے انجام اور نتیجہ) سے پیچھے رکھیں۔اس کی جمع آثام آتی ہے۔اس کے اصل معنی میں تاخیر کا مفہوم پایا جاتا ہے (۱)۔کیونکہ آثم، بوجہ ضعف و اضمحلال کارگاہِ حیات میں لوگوں سے پیچھے رہ جاتا ہے یا اسے کسی نفع بخش کام کی تکمیل میں تاخیر ہوجاتی ہے۔اسی لیے عربی میں الآ ثـمـــہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تھکاوٹ کی وجہ سے مضمحل ہوچکی ہو اور اضمحلال کی وجہ سے دوسری اونٹنیوں سے پیچھے رہ جائے یا منزل مراد تک پہنچنے میں اسے دیر ہوجائے۔

اثم کے مفہوم کی وضاحت کا مقصد یہ بتانا ہے کہ انسانی ذات میں جن اعمال کے سبب یہ اضمحلال اور ضعف پیدا ہوتا ہے وہی ضعف آگے چل کر انسان کو سفرِ حیات میں سُست گام یا ناکام کردیتا ہے۔اسی لیے قرآن نے خمر اور میسر کے تعلق سے فرمایا ہے:

> قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۔(البقرہ/۲۱۹)

آپ بتادیجیے! نشہ آور اشیاء اور بغیر محنت کے جوئے سے حاصل فائدے تمہارے اندر بہت زیادہ اضمحلال اور شکستگی پیدا کردیتے ہیں اور تمہارے قوائے عمل کو مفلوج بنادیتے ہیں۔گو اس

رئیس کلیہ معارف اسلامیہ، جامعہ کراچی۔

میں ظاہری پہلو سے لوگوں کو نفع تو پہنچتا ہے مگر باطن میں اس کے برے اثرات، اس منافع سے کہیں بڑھ کر ہوتے ہیں اسی لئے ان چیزوں کے استعمال کی ممانعت کی گئی۔ لیکن جنت کے مشروب کے بارے میں قرآن مجید نے بتایا ہے:

يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ ۔ (الطور/۲۳)

وہ جنت میں ایک دوسرے کے ساتھ ایسے جام کا تبادلہ کریں گے جس کی تاثیر نہ فضول گوئی پر مشتمل ہوگی نہ کسی کمزوری واضمحلال پر۔

لسان العرب کے مطابق "منازعة الکاس" سے مراد پیالے کا ایک دوسرے کو دینا یا ایک دوسرے سے لینا ہے۔ امین احسن اصلاحیؒ کے بقول "تنازعوا الکاس" کے معنی ہیں "تعاطوھا" یعنی وہ آپس میں ایک دوسرے کی طرف شراب کے جام بڑھائیں گے۔ چھین جھپٹ اس لفظ کے لوازم میں سے نہیں ہے لفظ "کاس" ظرف اور مظروف یعنی شراب اور جام شراب دونوں کے لیے آتا ہے۔(۲) اسی لئے انہوں نے اس آیت کا ترجمہ بایں الفاظ کیا ہے "ان کے درمیان ایسی شراب کے پیالوں کے تبادلہ ہو رہے ہوں گے جو لغویت اور گناہ سے پاک ہوگی۔

اسی مفہوم کی تائید میں یہ آیت بھی ملاحظہ کیجئے۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ۔ (الواقعہ/ ۲۵-۲۶)

وہ اس میں (یعنی جنت میں) نہ کوئی فضول گوئی سنیں گے اور نہ انسانی ذات کو مضمحل کرنے والی چیز (دیکھیں گے) بلکہ وہاں صرف ایک ہی بات ہوگی، جو سراسر سلامتی پر مشتمل ہوگی۔

بعض علماء کے بقول اثم میں اس معنی کا لحاظ بھی رکھا گیا ہے کہ بالعموم یہ وہ جرم ہوتا ہے جس کا اثر انسان کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے۔ مطلب یہ کہ اثم اپنی ذات میں ایک فعل ہے اور عدوان دوسرے پر ظلم۔ جیسا کہ آتا ہے:

وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۔(المائدہ/۲)

اثم اور عدوان میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔ مگر جرم بہرحال جرم ہے، خواہ ذاتی نوعیت کا ہو یا اجتماعی نوعیت کا۔

قرآن مجید میں زانیوں کے بارے میں کہا گیا ہے۔

وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اَثَامًا ۔ (الفرقان/ ۶۸)
یعنی اس فعل کے مرتکب لوگوں کو بالآخر اضمحلال، افسردگی اور قوت مدافعت میں کمی (یعنی ایچ آئی وی/ ایڈز) کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ہمارے ترجموں اور تفسیروں میں ''اثاما'' سے مراد نتیجۂ گناہ کو لیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں اس مفہوم کے سوا کسی اور مفہوم کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ آپ اسے وبال کہہ لیں جیسا کہ مولانا محمد جونا گڑھی نے کہا:

''اور جو کوئی یہ کام کرے، وہ اپنے اوپر سخت وبال لائے گا''۔

یا اسے بدلہ کہہ لیں، جیسا کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کہا:

''یہ کام جو کوئی کرے گا وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا''۔

اسے سزا کہہ لیں جیسا کہ مولانا احمد سعید کاظمی نے کہا:

''اور جو ایسا کرے وہ اپنے کئے کی سزا پائے گا''۔

اسے انجام کہہ لیں جیسا کہ مولانا امین احسن اصلاحی نے کہا:

''وہ اپنے گناہوں کے انجام سے دوچار ہوگا''۔

اسے خمیازہ کہہ لیں، جیسا کہ ڈپٹی نذیر احمد نے کہا:

''وہ اپنے گناہوں کا خمیازہ بھگتے گا''۔

یا ان الفاظ کا کوئی اور مترادف بنا لیں۔ بہرحال اس سے نفس معنی پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مقصود کلام یہ ہے کہ ہم نے ''اثاما'' کا ترجمہ ایچ آئی وی/ ایڈز سے کر دیا ہے۔ کیونکہ یہ اسی فعل بد کا نتیجہ ہے۔ (۳) ایچ آئی وی/ ایڈز، عصر حاضر کی خطرناک بیماریوں میں سے ایک ایسی بیماری کا نام ہے جو زمانہ حال کی دریافت ہے۔ (۴) اس بیماری کے انکشاف سے پہلے ''اثاما'' کا ترجمہ اس لفظ سے کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے ہمارے علماء نے اگر یہ مفہوم ادا نہیں کیا تو اس کی توقع بھی ان سے نہیں کی جاسکتی۔ لیکن فی زمانہ ایچ آئی وی/ ایڈز کے بارے میں میڈیکل سائنس کی تحقیقات نے اثاما کے معنی سمجھنے میں بہت مدد دی ہے۔

واضح ہو کہ ایڈز کی تعریف بایں الفاظ کی گئی ہے:

''ایچ آئی وی کا مطلب ہے انسانی قوت مدافعت میں کمی کا وائرس، یہ ایک ایسا وائرس ہے جو جسم کے مدافعتی نظام پر حملہ کرتا ہے۔ ایک عرصے کے بعد ایچ آئی وی جسم کو اس حد تک کمزور کر دیتا ہے کہ معمولی بیماری کے خلاف بھی مدافعت کی سکت نہیں رہتی اور آخر کار متاثرہ شخص میں بیماری کی علامات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کیفیت کو ایڈز کہتے ہیں۔ ایڈز کا مطلب ہے۔ ''مدافعتی نظام میں کمی کی علامات'' جب کوئی شخص ایڈز کا شکار ہو جائے تو کوئی بھی بیماری اس پر آسانی سے حملہ آور ہو کر موت کا سبب بن سکتی ہے''۔(۵)

ایڈز کی تعریف جاننے کے بعد قرآنی لفظ اثاما کا معنی ایک نئے انداز میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ چونکہ ایڈز کی بیماری بنیادی طور پر ناجائز جنسی تعلقات کے نتیجے میں لاحق ہوتی ہے اور اس بیماری میں مبتلا شخص اپنی قوت مدافعت کھو بیٹھتا ہے۔(۶) اس لیے اس پر اضمحلال، افسردگی اور محرومی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو بالآخر اسے موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ قرآن نے یہی بات لفظ اثاما کے ذریعے بیان کی ہے۔ اس لیے جدید اصطلاح میں تفہیم مطالب کے لیے اگر اثاما کا ترجمہ ایچ آئی وی/ ایڈز سے کر دیا جائے تو شاید غلط نہ ہو۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ قرآنی الفاظ کی اعجاز آفرینی، شان جامعیت اور ادائے مفہوم میں اس کی بلاغت ہر دور میں اپنا لوہا منواتی رہی ہے اور آیندہ بھی منواتی رہے گی۔

ایک حدیث مبارکہ میں اثم کی یہ تعریف آئی ہے:

والاثم ماحاک فی نفسک و کرهت ان یطلع علیه الناس ۔(۷)	اور اثم وہ چیز ہے جو تیرے اندر اثر کر جائے اور راسخ ہو جائے اور تو پسند نہ کرے کہ لوگوں کو اس کی خبر ہو۔

مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام کے یہ زرین الفاظ جس طرح کسی جرم اور گناہ کے حتمی نتائج کے بیان میں شان بلاغت کے حامل ہیں۔ وہیں ایڈز کی تعریف پر بھی کامل طور پر صادق آتے ہیں۔ کیونکہ ایڈز ایک ایسی ہی بیماری ہے جو ضعف و اضمحلال کی صورت میں پورے انسانی وجود میں اپنا اثر دکھاتی ہے اور ایڈز کا مریض نہیں چاہتا کہ لوگوں کو اس کی خبر ہو۔

''اثاما'' کا ترجمہ ایچ آئی وی/ ایڈز کرنے کی صورت میں ضمناً ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک غیر متعدی بیماری ہے اس لیے کہ اثم اور اثام میں یہ مفہوم بھی پایا جاتا ہے کہ یہ وہ فعل ہے جس کا اثر انسان کی اپنی ذات پر ہوتا ہے نہ کہ کسی اور کی ذات پر۔

وَمَنْ یَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا یَكْسِبُهٗ عَلٰی نَفْسِهٖ ۔(النساء/۱۱۱)

اور جس کسی نے اثم کمایا۔اس کا اثر خود اس کی ذات پر ہوگا۔(نہ کہ کسی دوسرے کی ذات پر)

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا قانون مکافات بالکل بے لاگ ہے وہ بے قصوروں کو نہیں پکڑتا۔ایڈز کے لٹریچر میں لکھا گیا ہے:

> ''ایچ آئی وی اور ایڈز سے متاثرہ افراد کی دیکھ بھال کرنا، ان کے ساتھ رہنا، کام کرنا، مساجد اور اسکول جانا ایک محفوظ عمل ہے۔کھانا اکٹھے کھانا، ایک دوسرے کے کپ، پلیٹس، کانٹے، چمچ، تولیئے، کتابیں، بینچ، کرسیاں، ٹیلی فون، دفتری سامان، لیٹرین یا غسل خانے استعمال کرنے سے ایچ آئی وی نہیں پھیلتا۔ ہاتھ ملانے، مصافحہ کرنے معانقہ کرنے، چھونے، بات چیت کرنے، کھانسنے یا قریب بیٹھنے سے بھی ایچ آئی وی نہیں پھیلتا''(۱۰)

ہم سمجھتے ہیں کہ ایچ آئی وی/ ایڈز ایک قابل علاج مرض ہے، کیونکہ سورۂ فرقان میں جہاں یہ آیت آتی ہے۔وہاں ان لوگوں کا استثناء بھی کر دیا گیا ہے۔جو توبہ کر لیتے ہیں۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا ۔ الفرقان/۷۰)

ہاں وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں، جو توبہ کر لیتے ہیں اور اپنی باقی ماندہ توانائیوں کو بچا لیتے ہیں اور مثبت اعمال کو اپنا معمول بنا لیتے ہیں۔

توبہ دراصل واپسی کے عمل کا نام ہے۔بندہ جب کسی فعل بد میں مبتلا ہو پھر اسے ترک کر دے اور حسن عمل اختیار کر لے تو اس واپسی کو توبہ کہتے ہیں۔چنانچہ اس مقام پر توبہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ بدکاری کرنے والا اگر اپنی اس روش کو ہمیشہ کے لیے ترک کر دے اور طبیعی اسباب کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنا علاج کرائے تو یقیناً ایڈز سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔کیونکہ ایسے ہی توبہ کرنے والوں کے لیے آیا ہے۔

فَـاُولٰٓـئِکَ یُبَـدِّلُ اللّٰــہُ سَیِّـاٰتِھِمْ حَسَنٰتٍ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۔ پس یہی وہ لوگ ہیں کہ جن کے سیئات کو اللہ تعالیٰ حسنات میں بدل دے گا۔
(الفرقان/۷۰)

یعنی ایسے لوگوں کے مرض کو اللہ تعالیٰ مبدل بہ صحت کردے گا۔ وہ روحانی طور پر بھی صحت یاب ہوجائیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اعمال بد کے برے اثرات ونتائج کو مٹانے والا اور مسلسل رحم فرمانے والا ہے۔

تفسیر روح المعانی کے مطابق سیئات سے مراد یہاں بدی کی قوت ہے اور حسنات سے مراد نیکی کی قوت ہے۔(۹) اس قول سے یہ مفہوم بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ایچ آئی وی/ ایڈز کے مریضوں میں ان کے عمل توبہ سے کوئی ایسا روحانی اثر ضرور پیدا ہوجاتا ہے جو بالآخر اس منفی قوت (یعنی وائرس) کو ہی ختم کرکے رکھ دیتا ہے جس نے انہیں اس حال سے دوچار کیا۔ وہ اپنی قوت ارادی سے اپنی بیماری پر قابو پالیتے ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ سورۂ فرقان میں بیک وقت ایک ہی مقام پر متصلاً دومرتبہ توبہ کا جوذکر ہے۔ وہ بلا سبب نہیں ہے۔ دراصل پہلی توبہ وہ ہے جو ایڈز کے تناظر میں ہے گویا یہ بتانے کے لیے کہ اس مرض کا ازالہ ممکن ہے اگر مریض چاہے تو............جبکہ دوسری توبہ ” وَمَــنْ تَــابَ وَعَـمِـلَ صَالِحًا فَاِنَّہٗ یَتُوْبُ اِلَی اللّٰہِ مَتَابًا “ (الفرقان/۷۱)۔ میں مذکور ہوئی وہ دراصل ”وَمَـنْ یَّـفْـعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اَثَامًا“ کے مقابلہ پر ہے۔ اس میں رجوع کرنے والوں کے لیے عظیم بشارت موجود ہے اس قرآنی فقرہ میں متـابـا کی تاکید تفخیم شان کے لیے ہے یعنی واپسی کا یہ عمل اپنے نتیجہ کے اعتبار سے انتہائی شاندار ہوگا۔ بایں معنی معلوم ہوا کہ ایڈز زدہ شخص اگر اپنے انجام کی بہتری چاہتا ہے تو پھر اسے وہ توبہ کرنی پڑے گی، جو خدا کو مطلوب ہے یعنی کامل درجہ کی توبہ، جو اپنی اثر آفرینی میں سو فیصد نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ آیت میں فعل زنا اور اس کے نتیجے کو جس صیغے اور اسلوب میں بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بھی مترشح ہے کہ فعل زنا کا مرتکب، جب عادی مجرم ہوتا ہے تب اسے فطرت کی جانب سے یہ ضرر لاحق ہوتا ہے شدت جذبات سے مغلوب ہوکر کسی حادثاتی امر

کے نتیجے میں کبھی کبھار کے مرتکب بہرحال اس کی زد میں نہیں آتے۔

مگر یہ حقیقت فراموش نہیں ہونی چاہئے کہ اس فعل بد کا ایک مرتبہ ارتکاب کر لینا ہی حالات میں ایچ آئی وی/ایڈز کی جانب بڑھنے والا پہلا قدم ثابت ہوتا ہے۔ یہ امر دیگر ہے کہ فی الفور توبہ کے ردعمل میں فطرت کی مشفقانہ نہیں اسے اپنی آغوش رحمت میں لے لیں۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَأُولٰٓئِكَ يَتُوبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۔ (النساء/۱۷)

توبہ کرنے والوں پر رجوع بہ رحمت ہونا اللہ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ بشرط یہ کہ کسی برائی کو شدت جذبات سے مغلوب ہونے کی کیفیت میں کیا گیا ہو، پھر فوراً ہی احساس ندامت نے رجوع الی اللہ پر مجبور کر دیا ہو۔ پس یہی وہ لوگ ہیں کہ جن پر اللہ اپنی رحمت کے ساتھ رجوع فرماتا ہے کیونکہ وہ علم وحکمت والا ہے۔ (اس لیے اس کا قانون فطرت بھی مبنی بر علم وحکمت ہے)

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّئَاتِ حَتّٰٓى إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ أُولٰٓئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيْمًا ۔ (النساء/۱۸)

البتہ ان لوگوں کے لیے کوئی بخشش معافی (اور صحت) نہیں ہے جو عادی مجرم ہیں اور اپنی حرکتوں سے اس وقت باز آتے ہیں، جب ان کی موت کا پروانہ جاری ہو چکا ہوتا ہے اور (اسی طرح) وہ لوگ بھی کسی رحمت کے مستحق نہیں ہیں جو تمام زندگی ناشکری (کفران نعمت) میں گزار دیتے ہیں، دراصل یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے (دنیا وآخرت دونوں میں) الم انگیز عذاب تیار کیا گیا ہے۔ (۱۱)

واضح رہے کہ توبہ کی قبولیت اور عدم قبولیت کا یہ دوٹوک فرمان جس سیاق میں آیا ہے وہ سیاق بھی بدکاری اور حرام کاری کا ہے۔ جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس فعل بد کے مرتکبین دو حصوں میں منقسم ہیں۔ قسم اول میں وہ لوگ ہیں جو اتفاقیہ غلطی کر بیٹھتے ہیں اور قسم دوم میں وہ

لوگ ہیں جو اس فعل بد کا عادتاً ارتکاب کرتے ہیں اور اس وقت تک کرتے رہتے ہیں جب تک فطرت کا تازیانہ ان کی پیٹھوں کو مجروح اور مضمحل نہیں کر دیتا۔ یہ آخری اسٹیج کے مجرم ہیں اور بلاشبہ اس لائق ہیں کہ ان کے ساتھ کوئی ہمدردی نہ ہو۔

ہمارے یہاں ایڈز کے بارے میں لٹریچر شائع کیا گیا ہے اس میں لکھا گیا ہے کہ ''یہ وائرس ہمارے جسم میں درج ذیل طریقوں سے داخل ہوسکتا ہے۔

۱-غیر ازدواجی۔ ۲-غیر محفوظ۔ ۳-غیر فطری جنسی تعلقات سے۔(۱۲)

غیر ازدواجی اور غیر فطری جنسی تعلقات کے ساتھ غیر محفوظ کے لفظ کی پیوند کاری نے بظاہر ایچ آئی وی/ایڈز کے مریضوں کے لیے توبہ کی جڑ ہی کاٹ کے رکھ دی ہے۔ غیر محفوظ کے لفظ سے یہ مفہوم اخذ ہوتا ہے کہ یہ فعل بد کسی کنڈوم وغیرہ کی مدد سے جاری رکھا جاسکتا ہے۔ حالانکہ غیر محفوظ کے لفظ سے ان کی یہ مراد ہرگز نہیں ہے جیسا کہ ایک مقام پر لکھا گیا ہے۔ ''متاثر ہونے کی صورت میں شریک حیات کے ساتھ کنڈومز کا درست اور مسلسل استعمال'' اس لیے اس مقام سے انہیں یہ لفظ قلم زد کر دینا چاہئے تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی کو راہ نہ مل سکے۔

ایڈز کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ناقابل علاج مرض ہے۔(۱۳) مگر یہ بات انسانی علم کی کمزوری پر مشتمل ہے، امر واقعی پر نہیں پیغمبر انسانیت ﷺ نے تمام انسانوں کو آگاہ کر رکھا ہے کہ:

لکل داء دوآءٌ فاذا اُصیبُ دَواءُ الداءِ بَرأ باذن اللّٰہ عزوجل ۔(۱۴) ہر بیماری کی دوا ہے جب وہ دوا بیماری کے موافق ہوجاتی ہے تو اللہ عزوجل کے اذن سے شفا مل جاتی ہے۔

اس مختصر سے جملے میں معانی ومفاہیم کا ایک جہاں آباد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بیماریوں کے اندفاع کے لیے ریسرچ کرنا تعلیمات نبوی ﷺ کے عین مطابق ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایڈز کے مریضوں کو مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ قرآن مجید کے دیے گئے حیات بخش اور اثر آفریں پروگرام کے مطابق وہ اگر اپنی زندگی گزاریں تو یقیناً صحت مند وتوانا ہوسکتے ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) الاثم والآثام للافعال المبطئۃ عن الثواب، وجمعہ آثام وتضمنہ لمعنی البط۔ المفردات فی غریب القرآن،

کتاب الالف،ص۱۰، نور محمد کارخانہ، تجارت کتب، آرام باغ کراچی۔(۲) تدبر قرآن، جلد۸،ص ۲۷، حاشیہ زیر آیت متعلقہ، سورہ طور۔(۳) داورلڈ بک انسائیکلو پیڈیا، جلد ا،ص ۱۵۳، (۱۹۸۵ء)۔

The disorder has affected primarily homo sexual or bi sexual men, particularly those with many sexual partners.

(۴) ایضاً، .The first cases of AIDS were diagnosed in 1981

(۵) ایچ آئی وی کی روک تھام میں دینی رہنماؤں کا کردار۔ اولین اشاعت، جاری کردہ نیشنل ایڈز کنٹرول پروگرام، حکومت پاکستان، ص ۶۔

(۶) ورلڈ بک انسائیکلو پیڈیا۔ .Victims of AIDS lose the ability to fight off disenses

(۷) صحیح مسلم، کتاب البرّ والصلة والآداب ،رقم الحدیث ۶۳۹۴، حاک الشیء فی صدری ۔فلاں چیز میرے دل میں جم گئی۔ ماحاک سیفه ،اس کی تلوار نے نہیں کاٹا، کہتے ہیں "ضربه فما احاک فیه سیفه" اس نے تلوار ماری مگر کارگر نہیں ہوئی۔(یہ ہمیشہ نفی ہی میں مستعمل ہوتا ہے) المنجد (عربی اردو) ص ۲۴۹، دارالاشاعت اردو بازار، کراچی، جولائی ۱۹۷۵ء۔(۸) ایچ آئی وی کی روک تھام، ص ۴۱۔(۹) المراد بالسیئات والحسنات ملکتهما لانفسهما ای یبدل عز وجل بملكة السیئات ودوا علیها فی النفس ملكة الحسنات بان یزیل الاولیٰ ویاتی بالثنایة ،جلد التاسع عشر ص ۵۰، مکتبہ امدایہ، ملتان۔ (۱۰) اور جو کوئی واپس پلٹ کر آ جائے، ہمیشہ کیلئے صحیح روش اپنا لے تو بلاشبہ اس کا اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹنا اپنے انجام کے اعتبار سے نہایت شاندار ہوگا۔ (۱۱) صاحب محیط نے زندگی کی خوشگواریوں کے چھن جانے کو الم کہا ہے اور ایڈز کا مریض بھی زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہوتا ہے۔(۱۲) ایچ آئی وی کی روک تھام، ص ۴۹۔

(۱۳) ورلڈ بک انسائیکلو پیڈیا There is as yet no known treatment that can reverse the immune defect of AIDS.

(۱۴) صحیح مسلم، کتاب السلام ،رقم الحدیث ۵۶۲۶۔

ہنداسلامی فنِ تعمیر-ایک مطالعہ

پروفیسر رضی احمد کمال

کسی سماج یا تہذیب کے معیار زندگی کا اندازہ ہم اس کے فن تعمیر کو دیکھ کر بخوبی کر سکتے ہیں، اس لیے کہ اس دور کے فن تعمیر میں اس کی مکمل تصویر نظر آتی ہے، اس کے مقاصد زندگی کی تکمیل کے قوت اظہار اور بلندئ خیال کے مطالعے کے لیے فن تعمیر ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، ویسے ابھی تک فن تعمیر کی کوئی مستقل یا مکمل تعریف پیش نہیں کی جا سکی ہے، پھر بھی جب یہ لفظ ہم استعمال کرتے ہیں تو ہر شخص اس کے معنی سمجھ جاتا ہے مثلاً جب ہم لفظ گھر کا استعمال کرتے ہیں تو گھر کی ایک تصویر سامنے آجاتی ہے، مسجد کے لفظ سے نظروں میں مسجد کا نقشہ گھوم جاتا ہے، ایسا اس لیے ہے کہ ہم ایک مخصوص تہذیبی ماحول میں پل بڑھ رہے ہیں اور فن تعمیر کا ایک تصور رکھتے ہیں جو ہمیں اپنے چاروں طرف کی زندگی میں نظر آتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس لفظ یعنی فن تعمیر کی تعریف میں دقت اس لیے پیش آتی ہے کہ یہ انتہائی شاعرانہ لفظ ہے، جب کہ اس تعریف کے تحت آنے والی عمارتیں شاعرانہ طرز پر نہیں پائی جاتیں، شاید اسی لیے ایک رجحان اس سلسلہ میں یہ بھی پایا جاتا ہے کہ جو عمارتیں پیکر حسن ہوں یا شاعرانہ طرز کی ہیں وہی فن تعمیر کا مظہر کہی جائیں گی، لیکن اس کا یہ قطعی مطلب نہیں ہے کہ فن تعمیر صرف شاعرانہ حسن کا ہی نام ہے، دراصل فن تعمیر ایک مظہر حیات ہے یہ جس قدر انسانی زندگی سے قریب ہوگا اس کا حسن اتنا ہی دوبالا ہوگا، ہم جب کسی فن تعمیر کا مطالعہ کریں تو یہ بات ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے کہ صرف اس کے عیوب و نقائص کو پیمانہ بنا کر اس کی اصل روح تک ہم نہیں پہنچ سکیں گے، بلکہ اس کے مثبت پہلو یعنی وہ جس خاص مقصد کے لیے اپنی مضبوطی اور خوبصورتی سے تعمیر کیا گیا ہے، موضوع فکر یہ ہونا چاہئے، تبھی

ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔

معنوی اعتبار سے اس فن پارہ میں کسی تہذیب یا سماج کے کارناموں کو دیکھا جاسکتا ہے۔

پروفیسر محمد مجیب نے فن تعمیر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے کہ ''فن تعمیر دراصل پیکر کو الفاظ میں اور الفاظ کو پیکر میں ڈھالنا ہے''۔ زیر نظر مضمون میں اسی تعریف کی روشنی میں ہند اسلامی فن تعمیر کے کچھ نمونہ پیکروں کو الفاظ میں ڈھالنے اوران الفاظ میں ہند اسلامی تہذیب کی اقدار کی تلاش کی کوشش کی گئی ہے۔

فن تعمیر اور زراعت دونوں ہی نے سطح زمین کی سجاوٹ کا اہم کام کیا ہے، ہندوستان میں مسلمانوں نے زراعت کے مقابلے میں فن تعمیر کو ترجیح دی، چنانچہ نئے نئے شہر بسا کر انتظامیہ کی شاخیں پھیلانے کو اہمیت دی جس کے نتیجہ میں فن تعمیر کو فروغ حاصل ہوا، گپتا عہد کے بعد ہندوستان میں شہر بسانے کا جو رجحان ختم ہو گیا تھا مسلمانوں کے آنے کے بعد ایک بار پھر شہری بستیاں توجہ کا مرکز بنیں اور شہر آباد ہونے لگے، شہر اور دیہاتوں کے درمیان کا فرق دونوں کی عمارتوں سے ہی ہوتا ہے، شہر کے ساتھ دولت کے جمع ہونے اور اقتدار کے قیام کے تصورات جڑے ہوئے تھے، ساتھ ہی ساتھ دفاع کا خیال بھی ناگزیر تھا، لہٰذا شہر کے چاروں طرف فصیل، اس میں داخلے کے لیے بڑے بڑے دروازے یہ سب شہر کے نقشہ کا ضروری اور بنیادی عنصر بن گئے۔

فصیل یا چہار دیواری کے اندر قلعہ کی تعمیر جہاں صاحب اقتدار کا مسکن اوراس کا خزانہ محفوظ رہ سکے اور اقتدار کے جواز اور عقیدہ کے اظہار کے لیے مذہبی عمارتوں کی تعمیر کی گئی، شہر کے منصوبے، قلعہ کی دیواروں اور عبادت خانوں کو دیکھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے بنانے والے کس طرز کے حالات کے تابع تھے۔

شہر دہلی کئی بار بسا اور اجڑا اجڑا اور بسا، اس کی ہر بستی اپنی ایک الگ داستان رکھتی ہے، مہرولی، تغلق آباد، سیری، جہاں پناہ فیروز شاہ کوٹلہ، دین پناہ اور شاہ جہاں آباد یہ سارے ہی شہر دہلی کے نقشے پر پھیلے ہوئے ہیں، ان شہروں کے آثار سے ہی ان کی بلندی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، دہلی کے مندرجہ بالا شہروں میں سے اگر ان تین شہروں کی عمارتوں کو ہی لے لیا جائے تو انہیں ہندوستانی مسلمانوں کا ایک قابل قدر کارنامہ کہا جائے گا۔ یہاں وہ عمارتیں موجود ہیں جو ہندوستان میں مسلمانوں کے دوسرے تہذیبی مراکز کے لیے نظیر بنیں۔

ترک مسلمانوں نے شمالی ہندوستان میں جب اپنا اقتدار قائم کیا اس وقت وہ اپنی تہذیبی میراث سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے، اسلامی فن تعمیر کا تصور یا نمونہ ان کی نظروں اور ذہنوں میں موجود تھا مثلاً مسجد کیسی ہو، مقبرہ کیسا ہو اور ان عمارتوں کی تکنیک کی باریکیوں سے بھی واقف تھے، محرابیں اور گنبد ان کے اس ملک میں آنے سے پہلے ان کی سرزمین میں رواج پا چکے تھے، یہاں آنے پر مسئلہ یہ تھا کہ تعمیرات کے لیے مسالے کون سے اور کہاں سے حاصل کیے جا سکتے تھے اور ان کے بنانے کے لیے معماروں اور صناعوں کو کہاں تلاش کیا جائے اور پھر ان اجنبی معماروں اور صناعوں کو یہ کیسے سمجھایا جائے کہ وہ خانہ خدا کیسے بنائیں، اس لیے کہ یہاں دستیاب معمار تو بت خانہ ہی بنانا جانتا تھا۔ جسے وہ اپنا عبادت خانہ تصور کرتا تھا۔ ہندو اور مسلم دونوں کے عبادت خانوں کے فن تعمیر میں زمین و آسمان کا فرق تھا، مندر کتنا ہی بڑا تعمیر کرلیا جائے مگر اس میں مرکزی حیثیت بت کو حاصل ہوتی ہے جو مندر کے ایک کوتاہ کمرہ میں رکھا جاتا ہے جسے وِمان کہتے ہیں، جہاں ایک شخص اپنے کو بت کے سامنے پیش کرتا ہے، وِمان میں بت تک رسائی اور اس سے عقیدت کا اظہار دونوں ہی شخصی معاملے ہوتے ہیں، اس کے لیے تنہائی ضروری تھی جو ایک کوتاہ کمرہ میں ہی حاصل ہوسکتی تھی، اگرچہ مندر کے لوازم میں کنڈ یا تالاب اور منڈپ بھی شامل تھے، جن سے مندر کی شان میں تو اضافہ ہوجاتا، مگر شخصی عبادت کا بنیادی تصور ان سب چیزوں سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔ البتہ وِمان کو اسی تصور سے نسبت تھی لہٰذا وہ ایک کوتاہ کمرہ ہی رہا۔

مسلمانوں کی عبادت ایک اجتماعی عمل ہے، جو ایک تنگ جگہ ممکن نہیں، اسی لیے کشادگی کو مسجد کے تصور میں اولین اہمیت حاصل ہے، ایسی صورت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے عبادت خانوں کے فن تعمیر میں کسی طرح کی مماثلت تلاش کرنا یا اس کی بنیاد پر کوئی مفاہمت قائم کرنا ممکن نہیں تھا۔

مسلمانوں میں جماعت کے ساتھ عبادت خانے میں اجتماعی عبادت کے اسی تصور نے مسجد کے فن تعمیر کو ایک جداگانہ طرز عطا کیا (۱)، مقبرہ کا اسلامی تصور بھی ہندوستان کے لیے اجنبی تھا، جیسا کہ ان عمارتوں کے آثار سے ظاہر ہوتا ہے، مسلمانوں نے یہاں جتنی بڑی تعداد میں مقبرے اور مسجدیں بنوائیں اتنی دوسری عمارتیں نہیں بنوائیں، اگرچہ آج ان میں سے بہت سی

محفوظ نہیں ہیں، لیکن جو مکمل یا جزوی طور پر باقی ہیں ان کے بلند و بالا بام و در اور گنبد و مینار ہندوستانی مسلمانوں کے فن تعمیر کے اعلیٰ ذوق کی مثال پیش کرتے ہیں، ان عمارتوں میں اگر چہ مختلف حصے مختلف تہذیبی روایات سے وابستہ ہیں مگر ان سب کا ایک جگہ ملنا یہی فن تعمیر کو ہندوستانی مسلمانوں کی خوبصورت دین کہا جائے گا، ہندی مسلم فن تعمیر کے بعض اجزاء کو اسلامی فن تعمیر سے جوڑنے اور بعض کو ہندو یا بودھ فن تعمیر سے جوڑنے کے خیالات بھی بعض محققین کے یہاں پائے جاتے ہیں، جب کہ اس فن تعمیر کے بعض اجزاء کی شناخت کرنے کے بعد یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ہندی مسلم فن تعمیر اسلامی اور ہندو روایات کی خوبصورت آمیزش کا نمونہ ہے، جبکہ بعض مغربی محققین نے اسے اسلامی فن تعمیر کا ہی ایک مقامی طرز قرار دیا ہے اور بعض اسے ہندو فن تعمیر کا ہی ایک نمونہ قرار دیتے ہیں (۲)، اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی مسلم عمارتیں ہمیں مل جائیں گی جو ہندو طرز سے اتنی قریبی مشابہت رکھتی ہیں کہ انہیں ہندو فن تعمیر کا نمونہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور دوسری طرف ہم کو ایسی بھی عمارتیں ملیں گی جو خالص اسلامی طرز لیے ہوئے ہیں ان میں ہندوستانی پن کا کوئی نشان نہیں ہے، لیکن ان مثالوں سے ہماری صحیح رہنمائی نہیں ہوگی، حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے زیر حکومت شام، مصر، یونان، روم، افریقہ، اسپین اور ایران کی اعلا تہذیبی اقدار کو اپنی تہذیبی اقدار میں اس خوبی سے شامل کرلیا تھا کہ اس کے نتیجے میں ایک نیا طرز وجود میں آگیا جسے اسلامی طرز کہا جانے لگا، پھر بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمان جہاں بھی گئے وہاں انہوں نے دھیرے دھیرے ایک ایسے طرز تعمیر کو ترقی دینے کی کوشش کی جس کی بنیادیں اس علاقے کے جغرافیائی حالات اور تہذیبی اقدار پر قائم تھیں، جس کی وجہ سے اس طرز کی اپنی ایک الگ ہی پہچان بن گئی۔

ہندوستانی مسلمانوں نے جس طرح مقامی مسالے اور معماروں وصناعوں کی مدد سے اسلامی فن تعمیر کے اصولوں سے تجاوز کیے بغیر یہاں اپنی عمارتوں کی تخلیق کی یہ ایک شاندار کارنامہ کہا جائے گا، اس لیے ہم اس خیال کی پرزور تائید کرتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے جس فن تعمیر کو جنم دیا اسے ہند اسلامی فن تعمیر ہی کہنا چاہیے (۳)۔ مسلمانوں کی یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے نسلی یا جغرافیائی مقامی آب و ہوا سے پیدا ہونے والی خصوصیات کے اظہار کو مفلوج

نہیں کیا (۴)، یہی وجہ تھی کہ اسلامی معمار ہندوستان میں جہاں بھی جا کر بسے وہاں کے مقامی طرز کو اپنانے میں اپنی پوری صلاحیت کا ثبوت دیا، جیسا کہ وہ پہلے بھی دیتے آرہے تھے (۵)، یہی وہ سب سے بڑا ذریعہ تھا کہ جس کی وجہ سے ہندو مسلم فن تعمیر کے کئی مقامی طرز وجود میں آئے، اگرچہ موسم اور وقت کے ظالم ہاتھوں نے ان رنگارنگ عمارتوں کے حسن کو مجروح کر دیا ہے پھر بھی ان میں پوشیدہ حسن اب بھی اتنی چمک دمک رکھتا ہے کہ اس پر نظر ٹھہرنا آسان نہیں ہے، ہند اسلامی فن تعمیر کے تمام نمونوں کو بغور دیکھنے کے بعد جو چیزیں ہمیں سب سے زیادہ متاثر کرتی ہیں وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے کس طرح نئے مقاصد کے اظہار کی خاطر اجنبی تکنیک کی واقفیت اور پھر اس میں پختگی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے روایتی مسالے سے ایسی عمارتیں تعمیر کیں جو ذوق جمال کا ایک شاندار نمونہ پیش کرتی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ نئے مقاصد نئی تکنیک اور نئے موسمی اور جغرافیائی حالات اور علاقائی روایات میں مطابقت پیدا کرنا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا، مطابق کے اسی طریقہ میں ہندوستانی مسلم تہذیب نے اپنے اظہار کے راستے متعین کیے۔(۶)

ترکوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد پہلی اہم عمارت مسجد قوت الاسلام تھی، اگرچہ اس کی تعمیر کی تاریخ ۱۱۹۹ھ ہے مگر حقیقت میں اس کا ارتقاء فیروز شاہ تغلق کے دور تک ہوتا رہا، جس نے مسجد کے مینار کی اوپری منزلوں میں ردوبدل کیا، اس مسجد میں جینی مندروں کے اجزا کا استعمال کیا گیا ہے ستون اور چھت سبھی جینی انداز کے ہیں، اس طرح کی بنی ہوئی عمارت سے عبادت کا مقصد تو حل ہوسکتا تھا مگر ذوق جمال کی تسکین ممکن نہیں تھی، اس میں حسن کا وہ رعب بھی نہیں تھا کہ جس سے پیشانی خود بخود جھک جائے، شاید تعمیر کے بعد مسلمانوں کو یہ مسجد مندر کا ہی نمونہ لگی ہوگی، اسی لیے اس میں ایک ایسے اضافے کی ضرورت محسوس کی گئی جس سے مسجد کی شان پیدا ہوسکے، یا اس کی اسلامی پہچان قائم ہوسکے، اسی مقصد کی خاطر مسجد کے صحن کے مغرب کی طرف مقصورہ قائم کیا گیا، جو محرابوں کا ایک سلسلہ ہے، چونکہ ان کے بنانے والے ہندو ہی تھے اس لیے انہوں نے ان محرابوں کو اسی تکنیک کی بنیاد پر بنایا جس پر وہ لوگ اپنے مندروں کے گنبد بناتے تھے، ان محرابوں میں مرکزی محراب (بیچ والی) خاص طور پر قابل توجہ ہے، اسے دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ ابھی خوشی سے اچھل پڑے گی، جیسی یہ محراب ہے ایسے سنگ تراشی کی

مثالیں کم ملیں گی، محراب کے چاروں طرف ہندوانی اشکال کے بیچ قرآنی آیات آسمان کی بلندیوں کو چھوتی نظر آتی ہیں، اس ملک میں عربی خط اور ہندوانی اشکال کے بیچ ایک مطابقت پیدا کرنے کی یہ پہلی اور انوکھی کوشش اور ابتدائی دور کا ایک قابل ستائش کارنامہ تھا، ان محرابوں کو دیکھنے سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی معماروں نے اپنے روایتی اصولوں کے مطابق ہی ان محرابوں کی تعمیر پر اصرار کیا ہوگا، مسلمانوں کے پاس بھی اپنے معمار نہ ہونے کی وجہ سے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ رہا ہوگا، اسی کے ساتھ ہندوستانی معماروں کو بھی اس بات کا یقین ہوگیا ہوگا کہ اب انہیں نئے مقاصد کے لیے نئی شکلیں بنانا ہوں گی، نئی شکلوں کے تعمیر کے لیے انہوں نے اپنی تکنیک پر اس لیے اصرار کیا ہوگا۔ مسلمانوں کی تکنیک کی واقفیت حاصل کرنے میں وقت اور تجربہ دونوں درکار تھا جس کی عدم موجودگی میں وہ کوئی خطرہ مول نہ لینا چاہتے ہوں گے۔

اجمیر کی مسجد اڑھائی دن کا جھونپڑ بھی اسی انداز کی تعمیر ہے، یہاں بھی ستونوں اور شہتیروں کو نئے منصوبے کے مطابق ترتیب دیا گیا تاکہ مسجد کا نقشہ تیار ہوجائے، بعدازاں اس میں صحن کے مغرب میں کمانوں کا ایک سلسلہ تجویز کیا گیا، ان دونوں کے تجربہ سے مسلمانوں کو اس بات کا اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ہندوستانی معماروں کے پاس وہ صلاحیت پورے طور پر موجود ہے جس کی مدد سے نئے تقاضوں اور ہندوستانی مسالے اور فن سنگ تراشی کے درمیان ایک خوبصورت مطابقت پیدا ہوسکے۔ قطب مینار جو مسجد قوت الاسلام کے جنوب مشرقی کونے میں واقع ہے اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ ہندوستانی معماروں نے اپنے مسلمان آقاؤں کے مقاصد کو سمجھنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کرلی تھی، یہاں قطب مینار کی تعمیر کا مقصد وہ نہیں تھا جو مسجد کے ساتھ مینار کی تعمیر کا ہوتا ہے۔ گوکہ اس کے پہلے درجہ یا منزل پر چڑھ کر اذان دی جاتی تھی لیکن اصل میں یہ فتح کی ایک یادگار اور مسلمانوں کے غلبے کا ایک نشان تھا جیسے ہندو اچھی طرح سمجھ سکتے تھے۔(۷)

ہندو معماروں نے اپنے مسلم آقاؤں کی فتح ونصرت کی کامیابی کے مردانہ تصور کو پتھروں میں ڈھالتے وقت ایک خوبصورت نسوانی لطافت عطا کردی، مینار وسط ایشیا کے ترکوں کی میراث میں شامل تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ قطب مینار کے بنوانے والوں کے پیش نظر بخارا اور غزنی

کے مینار مثالی نمونہ رہے ہوں گے۔(۸)

مینار کی موجودہ صورت ہندو صناعوں نے جن کا آبائی پیشہ سنگ تراشی تھا اپنے موروثی تصورات کے مطابق مینار کے غیر عمودی دباؤ کو نکالتے ہوئے اسے ایک مخروطی شکل دے کر اورفن سنگ تراشی کی مہارت کی مدد سے ایک لطیف احساس بنا کر پیش کر دیا۔اسی لیے یہ اپنے بھاری پن کے باوجود بھی ہندی مسلم جمالیات کا آئینہ دار بن گیا۔ مینار کے تمام عمارتی پہلو یا اجزا سنگ تراشی کے خارجی پردوں میں اس طرح چھپ گئے ہیں کہ یہ فن تعمیر کا نمونہ نہ رہ کر سنگ تراشی کا نمونہ بن گیا ہے۔شکل اور معنی کے اعتبار سے قطب مینار ایسا نہیں ہے جیسا کہ اس کے بنوانے والوں نے سوچا ہوگا، ترک اسے ایک طاقت اور استحکام کے نشان کے طور پر بنانا چاہتے ہوں گے، جیسا کہ اس کی بلندی اور اس کی بالائی منزلوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، مگر ہندو صناع یہاں بھی اپنی چھاپ ڈالے بغیر نہ رہ سکے(۹)،انہوں نے شاید یہی کہا ہوگا کہ ٹھیک ہے طاقت اور اقتدار تمھیں مبارک لیکن ہم اسے حسن و جمال سے اس طرح آراستہ کریں گے کہ جو بھی اسے دیکھے وہ یہ جان لے کہ حسن واحد قوت ہے جو باقی رہتی ہے طاقت اور اقتدار تو آنی جانی چیز ہے(۱۰)۔التتمش نے مسجد قوت الاسلام کی توسیع کے سلسلہ میں پہلی مسجد کے مقصورہ کے دونوں جانب کمانوں کا جو سلسلہ کھڑا کیا ان کی محرابوں اور سجاوٹ کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے سنگ تراشی میں ہندوستانی شکلوں کے استعمال کے بجائے اپنی ہی رسمی شکلوں پر اصرار کرنا شروع کر دیا تھا،مگر محرابوں کی تعمیر یہاں بھی ہندوستانی اصولوں کے مطابق ہوئی، مسجد کے توسیع شدہ حصہ کے شمال مغربی کونے کے پچھلے حصہ میں ایک مقبرہ ہے جو التتمش کے نام سے منسوب ہے، یہ ایک چھوٹا سا کمرہ، پرانی دہلی میں ہندی صناعی کی مدد سے اسلامی مقاصد کے لیے جو کام لیے گئے ہیں ان میں یہ بے مثال نمونہ ہے، اگرچہ نئی تکنیک کے استعمال میں ہندوستانی معماروں نے اناڑی پن دکھایا ہے پھر بھی اس کی خوبصورتی اپنی جگہ بے مثال ہے(۱۱)،اس مقبرہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ہندوستان کا سب سے پرانا مقبرہ ہے۔

اسلامی اور ہندی تہذیبی تضاد کے پیش نظر یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے کہ ترک مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے بعد تھوڑی سی مدت میں ہی ہندوستانی معماروں نے اپنے نئے

حکمرانوں کے مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنے ذہن کو کس طرح تیار کرلیا تھا، اپنے قدیم آقاؤں کے سیاسی زوال کے بعد نئے آقاؤں کی سرپرستی کو قبول کرنے میں ذرا بھی تامل سے کام نہ لیا اور ساتھ ہی اپنے فن کی بعض جزئیات کی برتری کا اعتراف بھی اپنے نئے آقاؤں سے کروالیا۔

سیاسی طور پر ترک سلطانوں کو راج پوت راجاؤں اور دیگر حکمرانوں کو قابو میں کرنے میں کافی دقت پیش آئی اور وقت بھی زیادہ لگا، مگر جہاں ان کی حکومت قائم ہوگئی وہاں انہوں نے ہندوستانی تہذیب کی ان قدروں کو اپنانا شروع کردیا جو اسلام کے بنیادی اور مسلمہ اصولوں سے نہیں ٹکراتی تھیں، چنانچہ اسی لیے ان مسلم حکمرانوں نے اپنی مسجدیں اور مقبرے جن کی حیثیت مذہبی ہوتی ہے ہندو صناعوں کے سپرد کرکے ان پر صرف اپنی نظر رکھی تاکہ وہ لوگ پوری آزادی کے ساتھ اپنا کام انجام دے سکیں، اس طرح شروع سے ہی ہندوستانی مسلمانوں نے تمام تر مذہبی اور سماجی پابندیوں کے باوجود نئے اور اجنبی حالات میں اپنے اظہار کے لیے زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے مقابلے میں فن تعمیر میں زیادہ آزادانہ طور پر کام لیا، یعنی اجنبی ماحول میں اپنی بقا کے لیے یہاں کی تہذیب میں اپنی طبیعت کے مطابق قدروں کی تلاش وجستجو کو فن تعمیر میں اس خوبصورتی سے پیش کیا گیا کہ نہ صرف کسی طرح کے تعصب کی نظر اس پر نہیں پڑسکی بلکہ اس کی اپنی ایک الگ پہچان ہونے لگی جسے ہندی اسلامی فن تعمیر کے نام سے پکارا جانے لگا۔

تقریباً ایک سو سال بعد علاء الدین خلجی نے قوت الاسلام مسجد کی اور توسیع کی، ظاہر ہے اس عرصہ میں آبادی میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہوگا، اس لیے توسیع کی ضرورت محسوس کی گئی ہوگی، مسجد کی لمبائی اور چوڑائی کے ساتھ ساتھ اس کے جنوب کی طرف ایک داخلی دروازہ بھی تعمیر کروایا جو علائی دروازے کے نام سے مشہور ومعروف ہے، یہ دروازہ اس عہد کے عروج کی یادگار ہے کہ جب ہندی معمار اپنے بیرونی آقاؤں کی ضروریات کی تکمیل کے لیے اپنی اعلیٰ صناعی سے کام لینا سیکھ گئے تھے (۱۲)۔ علائی دروازہ کے بنانے میں بیرونی تکنیک اور جمالیات دونوں کا خاص دخل ہے، اسی کے ساتھ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی صناعوں نے آرائش کے بدیسی اسالیب میں مہارت حاصل کرلی تھی۔

اس عمارت کے بعض اجزاء میں سیدھے سادے تر کی طرز تعمیر کو ایک نئے آرائشی اسلوب

سے متعارف کرایا گیا ہے، اس کے علاوہ ڈاٹ دار محراب کی شکل بھی پہلی بار اس عمارت میں نظر آتی ہے(۱۳)، علائی دروازہ کی کرسی کی باہر نکلی ہوئی چوکی کے بارے میں پروفیسر محمد مجیب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ اس بات کی مثال ہے کہ معمار مندر کے فن تعمیر کے ایک جزء کو اپنے مقصد کے لیے اختیار کر رہا تھا، علائی دروازہ کو پروفیسر محمد مجیب فن تعمیر اور فن سنگ تراشی کا ''وداعی بوسہ'' کہتے ہیں(۱۴)، ان دونوں فنون کا ملاپ ایک بار پھر گجرات میں دکھائی دیا مگر اس سے بھی پہلے دہلی ہی میں غیاث الدین تغلق کا سادا مگر پرشکوہ مقبرہ نمودار ہوا۔

علاء الدین خلجی (متوفی ۱۳۱۶ء) کے بعد ایسا لگتا ہے کہ عہد تغلق اور سادات کے معماروں کی طبیعتوں میں کچھ تبدیلی آ چکی تھی، جس کا ثبوت اس دور کی عمارتوں کو دیکھنے سے اچھی طرح ملتا ہے۔ شیر شاہ کے دور یعنی ۱۵۳۹ء تک عمارتوں کے نقشوں سے بہت زیادہ سادگی ٹپکتی ہوئی نظر آتی ہے، شاید یہ سادگی اس وقت کے سماجی اور سیاسی ڈھانچے کے انتشار کے بڑھتے ہوئے خطرہ کا نتیجہ تھی، تاریخی اعتبار سے اس تبدیلی کی سب سے زیادہ اہمیت اس لیے ہو جاتی ہے کہ اس دور کے طرز تعمیر میں مسلمانوں نے پورے طور پر ہندی اثرات سے آزاد ہو کر اسلام میں رائج اصولوں کو اپنی تعمیرات میں استعمال کرنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ عہد تغلق میں ہمیں جتنی بھی محرابیں ملتی ہیں وہ صحیح محرابیں ہیں جہاں جزئیات میں تقلید نہیں کی گئی ہے(۱۵)۔ چنانچہ اس وقت سے ہند اسلامی فن تعمیر کی ایک علاحدہ شناخت بننا شروع ہو گئی تھی، مگر یہ بات بھی صحیح ہے کہ مسلمانوں نے اپنے مقبروں اور مسجدوں میں ہندی اجزاء سے کام لے کر اکثر عمارتوں میں ایک تازہ خوش نمائی پیدا کر دی تھی، ایسی عمارتوں میں بہت سی صرف چار کھمبوں کی ہیں جن پر چھوٹے چھوٹے گنبد بنا دیے گئے، جینی ستونوں کی بارہ دری کو بھی اپنا لیا گیا تھا، جو ہشت پہلو والی عمارتوں میں دیے جاتے تھے، کیونکہ ان پر گول شکل دے کر گنبد بنانا آسان تھا(۱۶)، جہاں کہیں مسلمان ایسے مقام پر آباد ہوئے۔ جو پہلے سے ہندو، جینی یا بودھ ثقافت کے مرکز تھے، وہاں انہوں نے اسی طرح کے مرکب نمونے تیار کیے اور اسلامی اجزاء کو ہندی طرز میں ڈھالے بغیر مقامی ہندی طرز کو ہی اختیار کر لیا۔

علاء الدین کے بعد سیاسی اور سماجی تنظیم کو جو خطرات لاحق تھے اس کا عکس عہد تغلق کی

مسجدوں کے طرز تعمیر میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے، مساجد کی بلند اور مضبوط فصیلوں سے تحفظ کا احساس پورے طور پر نظر آتا ہے، جیسے بیگم پوری مسجد، اور کلاں مسجد وغیرہ جنھیں دیکھتے ہی پہلی نظر میں قلعہ کا گمان ہوتا ہے۔

چودھویں اور پندرہویں صدی عیسوی کی عمارتوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوانی تکلّفات کو چھوڑ کر مسلمانوں نے عمارتوں میں اسلام کی سادگی کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ے لیکن یہ سادگی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی جیسا کہ شیر شاہ سوری کے دور کی غیر معمولی آرائش سے پتہ چلتا ہے، اس عہد میں مسجدوں کو زیادہ آراستہ کیا جانے لگا، جن میں سنگ مرمر کی پچی کاری اور سنگ تراشی کے خوبصورت طرز سے ان کو سجایا جانے لگا (۱۸)۔ اس طرز کی ابتدائی عمارتوں میں وہ ساری باریکیاں اور خوبصورتی موجود ہے جو ہندی صناعی کا خاصہ تھی، مگر اس عہد کے آخیر میں ایک بار پھر پہلی جیسی باریکی اور جزئی سجاوٹ (خوبصورتی) کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ (۱۹)

عہد سلطنت میں مرکزی نظام کی کمزوری کے ساتھ ہی صوبائی حکومتوں کے وجود نے مختلف علاقائی طرز ہائے عمارات کو وجود بخشا، مثلاً جونپور، گجرات اور بنگال کے طرز تعمیر میں دہلی کے مرکزی طرز سے ہٹ کر اپنا ایک الگ طرز بنانے کی کوشش کی گئی، وہ شاید اس لیے کہ علاقائی حکمرانوں نے مرکز سے علاحدگی اختیار کرنے کے بعد اپنی آزاد شخصیت کی تعمیر کی طرف توجہ کی ہوگی۔ اس کے لیے مرکزی طرز سے گریز کرنا ضروری تھا تاکہ وہ اپنی آزادی کو مضبوط کرنے کے لیے اپنی جڑیں علاقائی تہذیب میں جما سکیں، جونپور کی اٹالا مسجد اور جامع مسجد اس کی نمایاں مثالیں ہیں، اپنے طرز میں یہ نیم ہندی ہیں مگر ان کے دروازے اسلامی طرز کے ہیں، ان عمارتوں کو دیکھنے سے یہ اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے بنانے والوں کو استحکام کی کس قدر فکر رہی ہوگی، لیکن استحکام کے اس اظہار نے ان عمارتوں کو اور دلکش بنا دیا ہے، جونپور میں بہت سی مسجدیں اور مقبرے ہیں جو ہندو اور جینی جزئیات کا مرکب ہونے کے ساتھ ساتھ مقامی تہذیب کے آئینہ دار ہیں۔

ہند اسلامی فن تعمیر نے ہندوستان میں جتنی بھی صورتیں اختیار کیں ان میں شاید سب سے نفیس طرز احمد آباد کا طرز سمجھا جائے گا (۲۰)۔ یہاں کی عمارتوں میں چاہے وہ مسجدیں ہوں یا

مقبرے ہندو یا جینی اثرات اخیر وقت تک دیکھے جاسکتے ہیں، ان میں محراب اسلامی نشان کے طور پر استعمال کی گئی، جب کہ ان عمارتوں کو محرابوں کی ضرورت نہیں تھی، مسجد میں روشنی اور ہوا کی ضرورت نے بلندی حاصل کرنے کے جن طریقوں کو استعمال کرنے پر مجبور کیا وہ گجرات میں ہند اسلامی فن تعمیر کا ہی عطیہ ہے، مسلمانوں کا ایک اور کارنامہ مینار ہیں، جو تعمیر کے حسن اور کاریگری کی باریکی میں اپنی مثال آپ ہیں۔(۲۱)

مقبروں میں بھی ہندی طرز غالب نظر آتا ہے، محراب یہاں بھی صرف تعمیری ضرورت کے تحت استعمال کی گئی ہے، مسجدوں اور مقبروں میں سجاوٹ کی خاطر چھجے کے ساتھ ہنس کا استعمال کیا گیا ہے، جو تہذیب کے پرسکون ہونے کا مظہر ہیں، اگرچہ خانقاہوں اور مسجدوں میں ہنس دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، لیکن گجراتی مسلمانوں کے وسعت تخیل کا یہ ایک کھلا ثبوت کہا جاسکتا ہے۔

مالوہ کی عمارتوں میں اگرچہ دہلی کا طرز صاف نظر آتا ہے، لیکن عمارتوں کی شکلوں میں اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اشرفی محل، جہاز محل، ہنڈولا محل اس کی اچھی مثالیں ہیں، دہلی کے طرز کو یہاں اپنانے کی شاید یہ وجہ رہی ہو کہ یہاں کا مقامی فن تعمیر کوئی نہ رہا ہو، پھر بھی علاقائی سالمیت کو باقی رکھنے کی غرض سے مرکزی طرز کو اختیار کرتے وقت عمارتوں میں ایک جدت یا نیاپن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ ان کا ایک علاحدہ طرز ظاہر ہوسکے۔

بنگال میں عمارتیں اینٹ سے بنانے کی پرانی روایت چلی آرہی تھی، چنانچہ مسلمانوں کے یہاں خودمختار ہونے کے بعد جو طرز عمارت وجود میں آیا اس کی بھی یہی خصوصیت ہے۔ چونکہ اینٹ کے علاوہ یہاں کوئی مسالہ نہیں مل سکا اس لیے کشادہ عمارتوں (مسجدوں اور مقبروں) کی پائیداری کے لیے محرابوں سے کام لیا گیا، یہ بنگالی طرز ہندوستان میں خالص اینٹ کا واحد ایسا نمونہ ہے جو اپنی ایک خاص مقامی حیثیت رکھتا ہے (۲۲)۔ یہاں نکیلی محرابوں کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ بنگالی معماروں نے چھت کی ایک نئی شکل بھی ایجاد کی، یہ کروی وضع کی چھت ہے جو مانسونی علاقوں میں بارش کے پانی کے تیزی سے بہہ جانے کے لیے ضروری تھی، یہ چھت ہندو اور مسلمانوں دونوں ہی میں مقبول ہوئی۔ دکن میں بھی گلبرگہ، بیجاپور اور گولکنڈہ میں مسلمانوں کے فن تعمیر کے اصولوں پر ہندوستانی ماہرین سے کام لیا گیا، ہند اسلامی فن تعمیر کا یہاں بڑا کارنامہ ایک بڑے کشادہ کمرہ پر عظیم

گنبد بنانے کی پائیدار تکنیک ہے۔

مغل دور حکومت: مغل فن تعمیر کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ شیر شاہ نے نہ صرف انتظامیہ بلکہ فن تعمیر میں بھی اکبر کو وہ راستہ دکھایا جس پر چل کر مغل شہنشاہ رتبۂ کمال تک پہنچ سکے، اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اعتبار سے شیر شاہ کا طرز تعمیر، مغلوں کے طرز عمارت کے لیے مثالی رہا ہے، مگر مغلوں نے چونکہ اس فن میں وہ کمال حاصل کیا کہ مندرجہ بالا پہلو ماند پڑ گئے۔

اکبر کا فلسفۂ صلح کل اس کی عمارتوں کا رہنما اصول بنا تو تیموریوں کا جمالیاتی شعور شاہ جہاں کی عمارتوں کی روح ثابت ہوا، ان دونوں مغل بادشاہوں کی عمارتیں رنگ اور وضع میں ایک دوسرے سے اس قدر جدا ہیں کہ معلوم ہوتا جیسے ان دونوں کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے، فن تعمیر کی ساری اہم جزئیات گنبد، محراب، مینار وغیرہ میں ان کے دور میں انقلابی تبدیلیاں پیدا ہوئیں، جس کی ایک بڑی وجہ وسطی ایشیا میں تیموریوں کی سرپرستی میں فن تعمیر میں ہونے والی ترقی تھی جو مغلوں کو ورثہ میں ملی تھی، شاہ جہاں نے خاص طور پر ایشیا کے صناعوں اور ماہرین فن تعمیر کو ہندوستان بلا کر تعمیری مقاصد میں استعمال کیا، جیسے کہ تاج محل کے معماروں میں وسط ایشیا اور ایران کے معماروں کی خاصی تعداد شامل تھی، مگر مجموعی طور پر جب اس عمارت کو دیکھئے تو یہ خالص ہندوستانی نظر آتی ہے، اکبر کی تعمیرات میں خاص طور پر فتح پور سیکری کی عمارتوں میں مختلف مقامی تہذیبوں کے فن پارے استعمال کیے گئے ہیں، فکر اور عمل کا ایسا قریبی تعلق اکبر کے علاوہ اور کسی کی عمارتوں میں نظر نہیں آتا، اس ربط کی جس قدر جھلکیاں اکبر کے فن تعمیر میں ملتی ہیں وہ کسی اور فن پارہ میں مشکل سے ملیں گی۔ اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ مسلمانوں کی عمارتوں کے مقاصد جو ان کی اسلامی تہذیب سے وابستہ تھے ان کی وجہ سے ہندوستانی طرز تعمیر میں بلندی اور کشادگی کا تصور شامل ہوا، ہندوستانی مسلمانوں نے کشادہ کمرہ کی چھت گنبد کی تعمیر کا آغاز وغیرہ کو ترقی دے کر اس کو بہت خوبصورتی سے حل کیا، جو کہ ایک بڑا کارنامہ تھا، ڈاٹ دار محراب گنبد کی تخلیق میں مددگار ثابت ہوئی، گنبد کی ڈاٹ دار محراب اور ڈاٹ دار چھت نے ایک طرف اگر عمارت کو پائیداری عطا کی تو دوسری طرف اس کو حسن و زیبائش بھی عطا کی، میناروں کی تعمیر سے وسیع عمارتوں میں توازن قائم کیا گیا، اس کے علاوہ مسلمانوں کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی تھا کہ

انہوں نے گپتا عہد کے بعد شہری بستیاں قائم کرنے کے رواج کو ایک بار پھر بڑے پیمانے پر شروع کر کے ہندوستانی فنون اور صنعتوں کو جلا بخشی۔

حواشی

(۱) انڈین مسلم محمد مجیب ۱۹۶۷ء، ص۱۸۴۔ (۲) کیمبرج ہسٹری آف انڈیا باب ۱۲۳، ص ۵۶۸۔ (۳) انڈین مسلم، ص۱۸۴۔ (۴) اسلامی فن تعمیر مترجم سید بہار الدین رفعت دہلی، ۱۹۵۲۔ (۵) اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں مترجم سید احمد ہاشمی، حیدر آباد، ص۴-۱۸۔ (۶) انڈین مسلم، ص۱۸۶۔ (۷) اسلامی فن تعمیر، ص۲۹۔ (۸) اسلامک انفلوئنس آن انڈین سوسائٹی، محمد مجیب ۱۹۷۲ء، ص۱۲۳-۱۲۲۔ (۹) ایضاً۔ (۱۰) ایضاً۔ (۱۱) اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں ص ۳۳۔ (۱۲) جیمس فرگسن اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں ترجمہ سید ہاشمی فرید آبادی حیدر آباد، ص۳۴۔ (۱۳) اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں، ص۴۱۔ (۱۴) ایضاً، ص۴۱۔ (۱۵) اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں، ص۴۱۔ (۱۶) ایضاً، ص۴۱۔ (۱۷) ایضاً، ص۴۵۔ (۱۸) ایضاً، ص ۴۶۔ (۱۹) ایضاً، ص۴۸۔ (۲۰) ایضاً، ص۵۹۔ (۲۱) ایضاً، ص۶۸۔

کتابیات

۱- دی انڈین مسلمس محمد مجیب ۱۹۶۷ء

۲- اسلامی فن تعمیر، مترجم سید بہار الدین رفعت دہلی ۱۹۵۲ء

۳- اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں مترجم مولوی سید ہاشمی فرید آبادی ۱۹۳۲ء

۴- اسلامک انفلوئنس آن انڈین سوسائٹی، محمد مجیب ۱۹۷۲ء

جہان شبلی

ڈاکٹر شمس بدایونی

جہان شبلی کی اس سے قبل تین قسطیں ہماری زبان، نئی دہلی میں شائع ہو چکی ہیں، اب اس کی چوتھی قسط قارئین معارف کی نذر ہے۔ اس عنوان سے اہل علم و ادب کی دلچسپی نے مزید قسطیں لکھنے پر آمادہ کیا۔ بنیادی مقصد اس عنوان کے تحت شبلی سے متعلق منتشر اور بکھری معلومات کو یک جا کر دینا ہے، تاکہ شبلی پر کام کرنے والوں کے لیے وہ خام مواد یا اضافی معلومات کی صورت میں کام آسکے۔

(۱)

رشید حسن خاں (ف ۲۰۰۶) نے اپنی کتاب 'زبان اور قواعد' (دہلی بار چہارم ۲۰۱۰) میں لفظ تنقید پر بحث کرتے ہوئے قاضی عبدالودود (ف ۱۹۸۴ء) کی کسی تحریر کا ایک اقتباس رسالہ 'معاصر' پٹنہ سے اخذ کر کے نقل کیا ہے جو حسب ذیل ہے:

> تنقید، لیکن جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے، یہ جعلی مصدر ہے جس سے عرب واقف نہیں۔ اس کے استعمال کی قدیم ترین مثال جو میرے علم میں ہے، ضیا برنی، معاصر خسرو کی 'تاریخ فیروز شاہی' میں ملتی ہے ء در تنقید روایات و تعریف رواۃ (ص ۱۰) شیرانی مرحوم نے ضمیمہ تنقید شعر العجم (ص ۵۵۲) میں عبداللہ خاں ازبک کے ایک درباری پایندہ محمد فضائی تخلص کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے جس کا تاریخی نام 'تنقید الدرر' ہے (۹۹۹ھ) فہرست کتب خانہ محمدیہ بمبئی (ص ۵۷۹) میں ایک کتاب 'تنقید الکلام المنسوب الی غوث الانام' ہے۔ اس کے مصنف کا نام حافظ ابوالاحیا محمد نعیم ہے اور مطبع نولکشور میں ۱۲۸۲ھ میں طبع ہوئی تھی۔

۵۸- نیو آزاد پرم کالونی، عزت نگر، بریلی یوپی۔

ان مثالوں سے یہ ثابت ہوگیا کہ بعض اصحاب کا یہ خیال کہ شبلی اس لفظ کے موجد ہیں، صحیح نہیں ۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس لفظ کو انہوں نے زندہ کیا ہے ۔ اردو میں عام استعمال ان کی بدولت ہوا ہو تو عجب نہیں ۔ زمانہ حال کے ایرانی مصنّفین (مثلاً آقائی پورداؤد) کے یہاں یہ لفظ ملتا ہے مگر میرا خیال ہے کہ یہ اردو کا اثر ہے ۔ (مجلّہ معاصر نمبر ا: ۱۴۵ بہ حوالہ زبان اور قواعد: ۶۳، ۶۴)

میری کم آگاہی ان ''بعض اصحاب'' کو تلاش نہیں کرسکی جنہوں نے شبلی کو اس لفظ کا موجد لکھا ہے ۔

(۲)

سرسید احمد خاں (ف ۱۸۹۸ء) کے نام شبلی کے دستیاب خطوط کی تعداد ۱۶ ہے ۔ شبلی کے نام بھی سرسید احمد خاں اور بعض دوسرے اکابر کے متعدد خطوط ان کے مجموعہ ہائے مکاتیب میں شامل ہیں جن کو ابھی تک یک جا نہیں کیا گیا ہے ۔ زیرنظر خط سرسید نے اپنے نواسے حکیم احمد الدین کو لکھا ہے جو دلی میں سرسید کے مکانات و جائداد کی دیکھ بھال کرتے تھے ۔ یہ دستی رقعہ ہے جو حکیم احمد الدین ہی کے مرتبہ قلمی 'مجموعہ خطوط' میں شامل تھا ۔ ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر (ف ۳۰/ نومبر ۱۹۹۹ء) نے اس قلمی نسخے کو مرتب کیا اور مع مقدمہ ۱۹۹۵ء میں اپنے مصارف سے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ سے چھپوا کر شائع کیا ۔ یہ مجموعہ زیادہ مقبول نہیں ہوسکا لہٰذا اس کے مندرجات پر بہت کم گفتگو ہوسکی ۔ خط حسب ذیل ہے:

عزیزی حکیم احمد الدین

مخدومی مولوی شبلی صاحب جن کو غالباً تم بھی جانتے ہو اور میری کوٹھی چھوٹے بنگلے میں رہتے ہیں، دو چار روز کے لیے دہلی میں جاتے ہیں ۔ بہ ذریعہ اس رقعے کے وہاں آویں گے، ان کو مکان میں اتارو اور سب طرح پر خاطر کرو ۔ ان کے لیے کھانا ان کی مرضی کے موافق کھلاؤ اور کسی طرح ان کو تکلیف نہ ہو ۔

والسلام خاکسار سید احمد

۱۸/ستمبر ۱۸۸۵ء چہارشنبہ (خطوط سرسید: ۶۶-۵۶)

مذکورہ بالا خط میں شبلی کے نام کے ساتھ لفظ 'مخدومی' کا استعمال جہاں شبلی کی علمی فضیلت کو ظاہر کرتا ہے وہیں سرسید کے دل میں ان کی حقیقی محبت کا بھی ترجمان ہے۔ شبلی، سرسید سے چالیس سال چھوٹے تھے۔ (پیدائش سرسید: ۱۸۱۷، شبلی ۱۸۵۷) صحیح معنی میں وہ عزیزی، عزیزم یا عزیز مکرم جیسے القاب کے مستحق تھے۔

(۳)

مولانا شبلی نے اپنی تصنیف 'المامون' کا حق ملکیت مدرستہ العلوم علی گڑھ کو دے دیا تھا۔ طبع اول (۱۸۸۷ء) چند ماہ میں فروخت ہوگیا۔ طبع دوم کے لیے سرسید نے دیباچہ لکھا اور شبلی کی فیاضی کا اعتراف میجر سید حسن بلگرامی (ف ۱۹۱۵ء) کے نام خط میں کچھ اس طرح سے کیا:

> پچاس نسخے المامون کے میں نے خدمت عالی میں روانہ کیے ہیں۔ 'گذشتہ تعلیم مسلمانان' کے نسخے صرف معدودے چند رہ گئے ہیں، اسی لیے وہ نہیں بھیج سکا۔ آپ نے جو کتابوں کو خرید فرمایا، غالباً آپ کو خیال ہوگا کہ گویا ایک اعانت مولوی شبلی کی ہے، مگر مولوی شبلی نے یہ کتابیں مع حق تصنیف وغیرہ کالج کی نذر کردی ہیں۔ ان کی قیمت یا منافع سے ایک حبہ کا فائدہ انہوں نے حاصل نہیں کیا اور آئندہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں صرف کالج کے فائدے کے لیے لکھتے ہیں، اپنا ذاتی فائدہ ان کو مقصود نہیں۔ ایسے جاہل آدمی ہیں کہ انہوں نے چند نسخے المامون کے بلا قیمت اپنے دوستوں کو بھیجنا چاہے۔ میں نے ہر چند اصرار کیا کہ جس قدر تمہارا دل چاہے لے لو۔ ہرگز نہ مانا، مجھ سے خرید لیں اور اپنے دوستوں کو بلا قیمت بھیج دیں۔
>
> 'الفاروق' کی نسبت جو آپ نے تحریر فرمایا، وہ سب درست ہے مگر اس کے ساتھ فیہ ما فیہ بھی ہے۔ اگر کسی کا دل ایسا مضبوط ہو کہ اس فیہ ما فیہ کو بھی صاف صاف مثل ایسے مورخ کے جو کچھ مذہب نہ رکھتا ہو لکھے، تو بلا شبہ نہایت عمدہ بات ہے۔ مگر کیا مولوی شبلی ایسا کریں گے؟ اگر نہ کریں گے تو کتاب ردی ہوگی۔　(مکتوبات سرسید ص: ۳۴۲)

مخدومی کی طرح لفظ جاہل میں بھی سرسید کی محبت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

(۴)

مولانا شبلی نے ۲۳/اپریل ۱۹۰۵ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں معتمد تعلیم کا منصب قبول کرلیا تھا، اپنے ''مختصر نوٹس وریمارکس'' کالم کے تحت ۲۸/مئی ۱۹۰۵ء کی اشاعت میں لکھا:

> ندوہ میں ہمارے مخدوم مولوی شبلی صاحب پہنچ گئے ہیں ......مولانا شبلی کی نسبت زیادہ کہنا فضول ہے، صرف یہ کہنا کافی ہے کہ وہ ہندوستان کے محمد عبدہ ہیں۔علوم دینی سے بھی واقف، فلسفہ جدیدہ سے بھی آگاہ، علوم ومذہب و فطرت اسلام کے اتحاد پر یقین رکھنے والے، کورانہ تقلید سے پاک، رسموں کی پابندی سے آزاد، تعصّبات کے دشمن، اصلاح کے حامی اوران عیوب سے بری ہیں جو اکثر علمائے زمانہ میں پائے جاتے ہیں......خدا کو ندوہ کو زندہ رکھنا منظور تھا کہ پہلے اس کے اہل حل وعقد نے مولانا کو منتخب کیا اور یہ بارگراں اس دوش پر رکھا جو اس کے اٹھانے کی خوب طاقت رکھتا ہے۔

نظامی پریس بدایوں اور ذوالقرنین بدایوں کے مالک و مدیر نظامی بدایونی (۱۸۷۲-۱۹۴۷ء) ماضی میں تحریک ندوۃ العلماء سے وابستہ تھے، انہوں نے ۲۶، ۲۷، ۲۸ مارچ ۱۸۹۹ء کے ایک اجلاس منعقدہ شاہ جہاں پور کی مختصر روداد بھی مرتب کی تھی جو مطبع محبوب المطابع کانپور سے ''مختصر کیفیت جلسہ ششم ندوۃ العلماء'' کے نام سے ۱۸۹۹ء میں طبع ہوئی تھی۔اس اجلاس میں انہوں نے ایک قومی نظم (قصیدہ نما) بھی پیش کی تھی۔جو تحریک ندوہ کی حمایت میں تھی۔

۲۸/نومبر ۱۹۰۸ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔نظامی نے اس کی تفصیلی رپورٹ ذوالقرنین میں شائع کی تھی، جس کی نقل راقم الحروف کے ذاتی ذخیرے میں موجود ہے۔ گمان بدرجہ یقین ہے کہ شبلی سے نظامی کی مراسلت بھی رہی ہوگی، لیکن ابھی تک ان کے نام کوئی خط دریافت نہیں ہوسکا ہے۔

(۵)

نظامی بدایونی نے مولانا شبلی (ف ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء) اور مولانا حالی (ف یکم جنوری ۱۹۱۵ء)

کی وفات کے بعد کتابی سائز کے ۸۶ صفحات پر مشتمل پر ایک کتاب باسم ''کسوف الشمسین'' اپنے پریس سے شائع کی تھی۔ کتاب پر سال اشاعت درج نہیں۔ عرض مرتب پر ۶/اپریل ۱۹۱۵ عیسوی تحریر ہے۔ لہٰذا کتاب کو ۱۹۱۵ء ہی کا مطبوع خیال کرنا چاہیے۔

اس کتاب میں اول شبلی اور حالی کی وفات پر لکھے گئے وفیاتی شذرات و مضامین ہم عصر اخبارات و رسائل سے اخذ کر کے دوعنوانات شبلی اور حالی کے تحت یک جا کر دیے گئے ہیں۔ بعد ازاں احسن مارہروی (ف ۱۹۴۰ء) کا ایک طویل مرثیہ (جو مسدس کی طرز پر ۵۹ بندوں پر مشتمل ہے) شامل ہے۔ جس میں دونوں اکابر کی موت کا ماتم کیا گیا ہے۔ شبلی سے متعلق تحریریں زمیندار لاہور (از قلم ......) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ (از قلم حبیب الرحمٰن خاں شروانی) عصر جدید میرٹھ (از قلم خواجہ غلام الثقلین) زمیندار لاہور (از قلم سید سلیمان ندوی) سے مع حوالہ اشاعت نقل کی گئی ہیں۔ لیکن مصنّفین کے ناموں کا اندراج نہیں کیا گیا۔ سید سلیمان ندوی (ف ۱۹۵۳ء) نے حیات شبلی (ص ۶۲۳) میں اس کتاب سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جو مولانا شروانی کے مضمون سے مقتبس ہے لیکن سید صاحب نے اسے نظامی کی تحریر سمجھ کر نقل کیا۔ یہ سہو محض اس وجہ سے ہوا کہ نظامی نے کتاب میں جمع کردہ تحریروں پر مصنّفین کے ناموں کا اندراج نہیں کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ مولانا شبلی اور حالی کی وفات پر یہ پہلی ماتمی کتاب ہے۔ جو آج کم یاب ہے۔

> اعظم گڑھ کے ساکن، معقولات، فلسفہ اور حدیث کے عالم۔ فارسی کے اچھے ادیب تھے۔ کسی قدر انگریزی بھی جانتے تھے، تحصیل علم سے فارغ ہو کر تھوڑے عرصے تک سرکاری ملازمت کرنے کے بعد علی گڑھ کالج کی پروفیسری پر مامور ہوئے۔ بلاد اسلام، ٹرکی، مصر و شام کا سفر کیا، ہر جگہ کتب خانے دیکھے، سفر سے واپسی کے بعد شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۸۹۸ء میں کالج چھوڑ کر حیدرآباد پہنچے اور وہاں ناظم علوم وفنون کے عہدے پر ممتاز ہوئے۔ چار برس بعد حیدرآباد سے مستعفی ہو کر لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کے سکریٹری ہوگئے۔ عربی کے ادیب اور اردو و فارسی نظم و نثر دونوں میں اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے، جس کا ثبوت ان کی تصانیف مطبوعہ سے ملتا ہے بتاریخ ۲۹/ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۴ء اپنے وطن

مالوف میں انتقال کیا۔بیس کتابیں ان کی تصنیف و تالیف سے مشہور عام و مقبول انام ہیں۔جن میں سے سیرۃ النعمان، الفاروق، الغزالی، سفرنامہ بلاد روم و شام، شعر العجم، الکلام، موازنہ انیس و دبیر مشہور ہیں۔سیرت نبویؐ ان کی سب سے زیادہ معرکۃ الآراء تصنیف ہے جس کو انہوں نے غیر مطبوعہ چھوڑا۔دارالتصنیف اعظم گڑھ سے سیرۃ النبیؐ کی دو جلدیں چھپ کر شائع ہوچکی ہیں۔(قاموس المشاہیر، طبع جدید، ج ۲، ص ۱۳)

مذکورہ بالا ترجمے میں تین باتیں غلط ہیں:

۱- شبلی کو فارسی کا اچھا ادیب لکھنا: اگر ادیب سے مراد شاعر سے ہے تو بلاشبہ وہ فارسی کے اہم شاعر ہیں، اگر اس سے مراد نثر نگار سے ہے تو فارسی میں سوائے ۳۳ مکتوبات اور ایک دیباچہ کے ان کی کوئی نثری یادگار محفوظ نہیں۔لہٰذا یہ بیان محل نظر ہے۔

۲- کسی قدر انگریزی جاننا: یہ بیان قطعی طور پر غلط ہے۔شبلی کے سوانح نویس اور تذکرہ نگار اس سلسلے میں خاموش ہیں، صحیح اور درست بات یہ ہے کہ شبلی انگریزی زبان سے ناواقف تھے۔انہوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی (ف ۱۹۷۷ء) کو لکھی ایک سند مکتوبہ ۵/ اپریل ۱۹۱۴ء میں خود اعتراف کیا ہے:

> ''میں انگریزی نہیں جانتا لیکن مصر و شام میں یورپ کا فلسفہ جس قدر عربی میں منتقل ہوا ہے، سب میرے پیش نظر ہے''۔(خطوط مشاہیر، طبع دوم، ص ۲۶، حاشیہ)

۳- نظامی نے شبلی کی تاریخ وفات ۲۹/ ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ لکھی ہے۔صحیح تاریخ وفات ۲۸/ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ/ ۱۸/ نومبر ۱۹۱۴ء ہے (حیات شبلی، ص ۷۲۳) ایسا معلوم ہوتا ہے، ۳۲ سے ۳۴ کتاب کی غلطی ہے، ہاں ۲۸ اور ۲۹ میں غلطی کا احتمال ہے۔

اس ترجمے کی یہ عبارت: ''بیس کتابیں ان کی تصنیف و تالیف سے مشہور عام و مقبول انام ہیں جن میں ...... مشہور ہیں''۔مولوی عبدالحق (ف ۱۹۶۱ء) کے اس معروف جملے: 'مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے لونی لگنی شروع ہوگئی ہے'، اور یہ کہ 'ان کی بعض کتابیں ابھی سے لوگ

بھولتے جاتے ہیں کچھ مدت کے بعد صرف کتاب خانوں میں نظر آئیں گی'۔(مقدمہ خطوط شبلی، آگرہ ۱۹۲۶،ص ۲۶) کا مسکت جواب ہے۔

(۷)

مولانا شبلی کے مجموعہ ہائے مکاتیب میں حسب ذیل خطوط شامل نہیں ہو سکے ہیں:

خط نمبر-۱: بہ نام حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مکتوبہ ۱۴/ اگست ۱۹۱۴ء، یہ خط مولانا شروانی کے اس مقالے میں شامل ہے، جو 'مرحومی علامہ شبلی نعمانی' عنوان سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ کی ۲۰، ۲۷/ جنوری ۱۹۱۵ء کی اشاعت میں شامل ہوا۔ بعد میں یہ مضمون مع خط کسوف الشمسین (خط: ۱۸ تا ۲۰) حیات شبلی (۱۷۴ تا ۱۷۶) مقالات شروانی (علی گڑھ ۱۹۴۶، ۱۷۵ تا ۱۷۷) شبلی معاصرین کی نظر میں (ص ۴۲ تا ۶۶) میں بھی شامل ہوا لیکن یہ خط مکاتیب کے مجموعوں میں ہنوز جگہ نہیں پا سکا۔

خط نمبر-۲: بہ نام مدیر آزاد یعنی شوق قدوائی، مطبوعہ روزنامہ آزاد لکھنؤ، ۲۲/ فروری ۱۸۸۹ء، شبلی کی کتاب المامون پر جو اختلافی تحریریں آزاد میں شائع ہو رہی تھیں، مدیر آزاد کے اصرار پر ان کے جواب میں شبلی نے یہ خط سپرد قلم کیا۔ یہ خط المامون کے عنوان سے مقالات شبلی ج ۸ میں شامل ہے۔ بہتر یہ تھا کہ یہ مکاتیب شبلی میں جگہ پاتا۔

خط نمبر-۳: بہ نام مولانا سید عبدالحئی حسنی، مکتوبہ ۷/ نومبر ۱۹۱۰ء، مشمولہ: حیات عبدالحئی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ندوۃ المصنفین دہلی طبع اول ۱۹۷۰ء، ص ۱۶۷ تا ۱۶۸۔

خط نمبر-۴: بہ نام مولانا ابوالکلام آزاد، مکتوبہ ۲۲/ مارچ ۱۹۰۳ء، مشمولہ: ماہنامہ لسان الصدق کلکتہ، مرتبہ عبدالقوی دسنوی، مکتبہ جامعہ دہلی ۲۰۱۱، ص ۲۰۰، ۲۰۱۔

اس خط کی نشان دہی پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے کی ہے۔ شبلی کا مولانا آزاد سے مراسلت کا زمانہ آغاز ۲۱/ اکتوبر ۱۹۰۵ء تھا۔ اس خط کے دستیاب ہوجانے کے بعد زمانہ آغاز ۲۲/ مارچ ۱۹۰۳ء (خطوط کی بنیاد پر) ہوگیا ہے۔ یہ خط مولانا آزاد کے ایک مضمون 'ترقی اردو اور تراجم علوم وفنون کا سلسلہ' (مطبوع لسان الصدق اگست وستمبر ۱۹۰۴ء) میں بر سبیل تذکرہ آگیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موضوع سے متعلق حصہ ہی اس میں شامل ہے۔ کچھ حصہ حذف کیا گیا ہے۔ خط حسب ذیل ہے:

مکرمی ! آپ کا دلچسپ والا نامہ پہنچا......ترجمہ کا میں مخالف نہیں ہوں ۔گذشتہ تعلیم میں سرسید نے مجھ سے وہ عبارت بہ جبر لکھوادی تھی ، میں نے سخت انکار کیا تھا،لیکن ان کا اصرار غالب رہا۔ میں تو ترجمے کو اصلی خدمت سمجھتا ہوں ۔بل کہ انشاءاللہ اس کا ایک باضابطہ سر رشتہ قائم کروں گا۔ شبلی

۲۲/مارچ ۱۹۰۳ء

خط کا پس منظر یہ ہے کہ سرسید انگریزی تعلیم کی جگہ صرف مشرقی علوم کی تحصیل اور ان کے اردو تراجم کے سخت خلاف تھے ۔اسی لیے انہوں نے پنجاب یونیورسٹی اور الہ آباد یونیورسٹی (جو مشرقی علوم اور زبانوں کا کورس جاری کرنا چاہتی تھیں) کی مخالفت کی تھی ۔شبلی کے رسالے 'گذشتہ تعلیم' میں بھی سرسید کے اس نظریے کی حمایت کی گئی تھی ۔آزاد نے اپنے مذکورہ مضمون میں 'گذشتہ تعلیم' کا متعلقہ اقتباس نقل کر کے شبلی کا یہ خط نقل کیا ہے اور بتایا ہے کہ علوم مشرقی کے ترجمے کی بابت شبلی کا اصل خیال سرسید سے مختلف تھا۔

خط نمبر ۵: مکتوب الیہ نامعلوم ۔مکتوبہ ۲۱/اپریل ۱۹۰۰ء ۔مشمولہ ۔حیات شبلی ،سید سلیمان ندوی ۔دارالمصنّفین اعظم ،۱۹۴۳ء،ص: ۳۴۸، ۳۴۹۔

حامد کے مفرور ہونے کا قصہ تم نے پہلے سنا ہوگا ۔۱۱/اپریل کو میرے پاس ان کا خط آیا کہ ''مجھ کو اب بھول جایئے''۔اس خط سے اس قدر پریشانی ہوئی کہ میں بالکل بدحواس ہوگیا۔ چار وقت تک کھانا نہ کھایا گیا اور ہر وقت رویا کرتا تھا۔

اسی اثنا میں شادی کی تاریخ آئی ۔لوگوں کو اصرار تھا کہ تاریخ نہیں ٹالنی چاہیے لیکن مجھ کو دل پر قابو نہ تھا ، نہ جاسکا ، ادہر مہمان وغیرہ آچکے تھے ، اور اس وجہ سے ان لوگوں کو بہت سبکی ہوئی ۔وہاں سے سمیع آئے کہ اعظم گڑھ ہی میں نکاح ہوجائے ، میں اس پر بھی راضی نہ ہوا ۔البتہ زیور اور کپڑا بھیج دیا کہ بعد طبیعت ٹھہرنے کے عقد ہوجائے گا۔

میاں حامد چند روز دربھنگہ میں رہ کر وہاں سے بھی کہیں چل دیے اور بالکل پتا نہیں ، اور غالباً مہینوں پتا نہ لگے۔

خط القاب وآداب اور دستخط شبلی سے عاری ہے ۔ایسا معلوم ہوتا ہے مکاتیب شبلی کی

ترتیب کے وقت سید صاحب نے شبلی کے خطوط منتخب کرنے کے جو اصول وضع اور اختیار کیے تھے۔ مذکورہ بالا خط ان اصولوں پر پورا نہیں اتر سکا۔ اور مکاتیب کے لیے منتخب نہیں کیا جا سکا۔ خط کی عبارت سے پیشتر سید صاحب کا یہ جملہ ''ایک صاحب کے نام ایک خط مورخہ ۲۱/اپریل ۱۹۰۰ء میں، جو درج مکاتیب نہیں'' (حیات شبلی: ۳۴۸) میرے اس خیال کی تصدیق کرتا ہے۔

سید صاحب نے شبلی کے بیٹے حامد نعمانی کے اچانک مفرور ہو جانے اور مولانا شبلی کے نکاح ثانی کے واقعے کے ذیل میں اسے درج کر کے شبلی کے اضطراب اور حواشی کو اجاگر کیا ہے۔

(۸)

راقم الحروف کو مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے مخطوطات سیکشن میں جناب عطا خورشید (علی گڑھ) کی عنایت سے شبلی کے دو خط دستیاب ہوئے۔ یہ دونوں خط غیر مطبوع ہیں۔ سطور ذیل میں انہیں پیش کیا جا رہا ہے:

۱- خط بنام نواب انتصار جنگ نواب وقار الملک مشتاق حسین خاں مکتوبہ ۷ (فروری) ۱۹۰۷ء۔ مخزونہ: ضمیمہ لیٹن یونیورسٹی سیکشن اردو مخطوطات نمبر ۱۳۵۔

> بخدمت جناب نواب انتصار جنگ دام مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، معمولی اطلاع دفتر سے جا چکی ہوگی، لیکن مزید احتیاط کے (طور) پر گذارش ہے کہ اس جلسہ ندوہ میں جو یکم و دوم مارچ کو ہوگا، آپ کا تشریف لانا ضروری ہے۔ نواب محسن الملک بہادر ضرور تشریف لائیں گے، لیکن اگر کالج کا جھگڑا نہ طے ہوا تو البتہ شاید نہ آسکیں۔
>
> راجہ نوشاد علی خاں صاحب نے مجھ کو خط لکھا ہے کہ وہ بھی ضرور شریک جلسہ ہوں گے۔ والتسلیم شبلی
>
> ۷/(فروری) ۱۹۰۷ء

یہ خط ندوۃ العلماء کے پیڈ پر ہے۔ کتابوں کا کاغذ بوسیدہ ہو کر جھڑ گیا ہے۔ لہٰذا ماہ فروری کا تعین قیاسی ہے۔

۲- خط بنام مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی (ف ۱۹۳۵) مکتوبہ ۲۷/جولائی ۱۹۰۷ء مخزونہ:
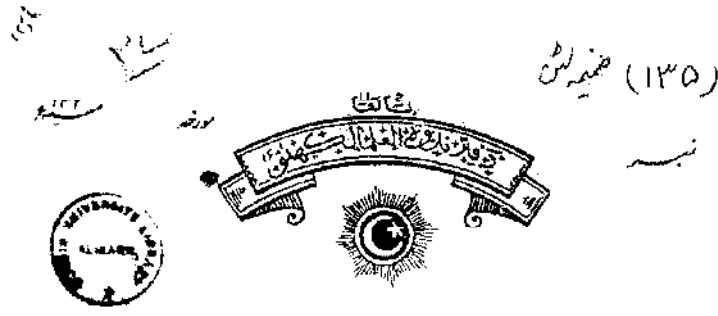
(۱۳۵) ضمیمہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ضمیمہ یونیورسٹی کلکشن اردو مخطوطات نمبر ۳۲۱۔

تسلیم۔ہاں میں مقطوع الرجل ہوگیا، خدا کا شکر ہے۔زخم کی تکلیف ابھی تک ہے موازنہ سے متبعین دبیر تو ناراض ہوئے ہوں گے، معلوم نہیں ارباب انیس کا کیا خیال ہے۔ والسلام شبلی ۲۷رجولائی ۱۹۰۷ء

یہ خط پوسٹ کارڈ پر ہے، جس پر مکتوب الیہ کا پتا لکھا ہے: جناب مرزا ہادی صاحب عزیز، نخاس جدید، لکھنؤ۔

INDIA POST CARD

THE ADDRESS ONLY TO BE WRITTEN ON THIS SIDE

۳-خط بہ نام سید عبدالحئیٔ حسنی (ف ۱۹۲۳ء) مکتوبہ ۱۴/جون ۱۹۱۰ء۔مخزونہ: علامہ شبلی نعمانی لائبریری، ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

یہ خط مولانا محمد ہارون صاحب (لائبریرین) کی عنایت سے حاصل ہوا۔ یہ خط مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (ف ۱۹۹۹ء) کے خاندانی رجسٹر سے برآمد ہوا۔جس پر مرقوم ہے ''رجسٹر خطوط مشاہیر ہندوستان بہ نام سید عبدالحئیٔ حسنی صاحب''۔ یہ رجسٹر ''حیات عبدالحئیٔ'' کی تصنیف کے دوران مولانا علی میاں رائے بریلی سے لکھنؤ لائے تھے لیکن یہ واپس نہ جاسکا۔اس میں شبلی کے تین خط تھے۔ دو خط حیات عبدالحئیٔ میں شامل ہوگئے (ص: ۱۶۷، ۱۷۹) پیش نظر خط کسی نامعلوم سبب کی بنا پر کتاب مذکور میں شامل ہونے سے رہ گیا۔حیات عبدالحئیٔ میں شامل دونوں خطوط کی اصل میں صرف ایک خط رجسٹر میں موجود ہے۔دوسرا خط یا تو اپنے مقام سے ہٹ گیا یا تلف ہوگیا۔خط حسب ذیل ہے:

مکرمی!

۱-دو تین ہفتے کے اندر جلسہ انتظامیہ کیجیے۔

۲- ایک تحریر بھیجتا ہوں یہ صرف ارکان موجودہ لکھنؤ اور مولوی خلیل الرحمٰن صاحب و مولوی حبیب الرحمٰن صاحب و مولوی مسیح الزماں صاحب کے پاس بھیجی جائیں۔ارکان موجودہ لکھنؤ کے پاس ایک ہی نقل بھیجنا کافی ہوگا۔

۳-آپ کو جو ضروری امور پیش کرنے ہوں، قلم بند کر لیجیے۔جلسہ میں آپ تاخیر نہ کیجیے۔ بہت سے کاموں کا ہرج ہوتا ہے۔اور اشاعت اسلام وغیرہ سب بے کار پڑے رہیں گے۔

شبلی

۱۴/جون ۱۹۱۰ء

(۹)

شبلی کی غیر مدون تحریروں میں اس سند کا اضافہ کیا جانا چاہیے جو انہوں نے مولانا عبد الماجد دریابادی کو لکھ کر دی تھی۔مولانا ماجد نے شبلی کے ایک خط پر حاشیہ چڑھاتے ہوئے اس سند کو نقل کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

۱۔ [illegible] ازحد [illegible] مقرر کیجیے

۲۔ [illegible] صرف ارکان موجودہ لکھنؤ

اور مولوی خلیل الرحمٰن صاحب و مولوی حبیب الرحمٰن صاحب [illegible]

[illegible] صاحب کے پاس بھی [illegible] ارکان موجودہ لکھنؤ

کے پاس ایک ہی نقل بھیجنا کافی ہوگا

۳۔ آپ کو جو [illegible] کرتے ہوں [illegible] کر لیجیے

[illegible]

[illegible]

محمد [illegible] ۱۴ جون ۱۹۱۰

لکھنؤ کینگ کالج میں فلسفہ پڑھانے کی جگہ عارضی طور پر خالی ہوئی تھی ۔ میں نے اس کے لیے کوشش کی تھی اور ایک سندنامہ مولانا سے بھی حاصل کیا تھا۔ نقل ملاحظہ ہو:

مولوی عبدالماجد صاحب بی اے کو ایک مدت سے جانتا ہوں ۔ ان کے علمی اور خصوصاً فلسفیانہ مضامین میں نے کثرت سے پڑھے ہیں ۔ مجھ کو یہاں تک معلوم ہے، ہندوستان میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو نہایت دقیق فلسفیانہ مسائل کو اس خوبی سے ادا کر

سکتا ہو جس طرح کہ عموماً مولوی عبدالماجد صاحب کے مضامین میں پائے جاتے ہیں۔

میں انگریزی نہیں جانتا لیکن مصر و شام میں یورپ کا فلسفہ جس قدر عربی میں منتقل ہوا ہے سب میرے پیش نظر ہے۔ میں بے تکلف کہہ سکتا ہوں کہ کسی عربی ترجمہ یا مستقل تصنیف میں بھی فلسفیانہ مسائل اس خوبی سے ادا نہیں کیے گئے ہیں۔

مولوی صاحب موصوف بالطبع فلاسفر ہیں۔ ان کا ذوق خالص علمی ذوق ہے۔ وہ ہمہ وقت فلسفہ اور متعلقات فلسفہ کے مطالعے میں مشغول رہتے ہیں اور یہ بالکل قطعی ہے کہ گو وہ فلسفہ میں ایم اے نہیں ہیں لیکن کثیر التعداد ایم اے سے بہتر ہیں۔ اگر وہ فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوں تو میں کالج کی خوش قسمتی سمجھوں گا۔

ان اوصاف کے علاوہ ان کے ذاتی اخلاق و عادات، متانت و سنجیدگی اور شرافت نسب کی بہتر سے بہتر شہادت دے سکتا ہوں۔

شبلی نعمانی ۵/اپریل ۱۹۱۴ء

(خطوط مشاہیر، ص: ۲۵، ۲۶ حاشیہ)

کتابیات

کتاب	مصنف	ناشر	سال
۱-حیات شبلی	سید سلیمان ندوی	دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۴۳ء
۲-خطوط سرسید	ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر	لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ	۱۹۹۵ء
۳-خطوط مشاہیر (حصہ اول)	عبدالماجد دریابادی	نسیم بک ڈپو لکھنؤ (طبع دوم)	۱۹۷۰ء
۴-زبان اور قواعد	رشید حسن خاں	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی	۲۰۱۰ء
۵-قاموس المشاہیر، ج ۲	نظامی بدایونی	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ (طبع دوم)	۲۰۰۴ء
۶-کسوف الشمسین	نظامی بدایونی	نظامی پریس بدایوں	۱۹۱۵ء
۷-ماہنامہ لسان الصدق کلکتہ	عبدالقوی دسنوی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی	۲۰۱۱ء
۸-مکتوبات سرسید	شیخ اسماعیل پانی پتی	مجلس ترقی ادب لاہور	۱۹۵۹ء

اخبار علمیہ

''انگریزی میں خطبۂ جمعہ''

کردستان میں ملازمت پیشہ اور سفارت سے وابستہ ایشیائی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کرد اور عربی زبان سے ناواقفیت کے سبب خطبۂ جمعہ میں دی جانے والی اسلام کی آفاقی تعلیمات و ہدایات کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے، اس لیے وہاں کی وزارت اوقاف و مذہبی امور نے لوگوں کی سفارش وخواہش کو پیش نظر رکھتے ہوئے السلیمانیہ شہر کی ایک مسجد موسوم بہ آزادی مسجد میں انگریزی خطبۂ جمعہ کی اجازت دی ہے، اس سلسلہ میں متعلقہ وزارت نے علماء اور مذہبی رہنماؤں سے بھی بات چیت کی ہے، انہوں نے اس فیصلہ پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کیا، ترجمان وزارت اوقاف میر وان نقش بندی نے کہا کہ اس کا مقصد ان مسلمانوں کو خطبۂ جمعہ کے موضوع اور اس کی ہدایات سے واقف کرانا ہے جو عربی اور کرد سے ناآشنا ہیں۔

''ایران میں اسناد کی خرید وفروخت''

''وائس آف جرمنی'' کی رپورٹ کے مطابق گوگل کے فارسی انٹرنیٹ سرچ انجن پر تھیسس کی خرید وفروخت کرنے والی بے شمار ویب سائٹیں سرگرم عمل ہیں، رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ایران میں صرف ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہی نہیں ملتا ہے بلکہ حسب ضرورت وخواہش جعلی اسناد بھی خریدی جاسکتی ہیں، اس قسم کے نام نہاد تاجروں کے پاس سب کچھ پہلے سے تیار ہوتا ہے، خواہش مند کو صرف نام اور ذاتی تفصیلات مہیا کرنے کی ضرورت رہتی ہے، وائیوا میں جواب دینے کے لیے پی ایچ ڈی اسکالروں کی خصوصی تربیت کا نظم بھی ہے، نامکمل مقالوں کو مکمل کرنے کی سہولت بھی فراہم کی جاتی ہے، اخراجات کے الگ الگ پیکج بھی دستیاب ہیں، حالانکہ ایرانی ضوابط وقوانین کے مطابق ڈاکٹریٹ کے لیے حاضری شرط ہے۔ اسی ناگفتہ بہ صورت حال کے سبب بعض مخالفین نے صدر ایران کی ڈاکٹریٹ کی سند پر بھی انگشت نمائی کی ہے، وزیر داخلہ علی کوردان نے اس سے قبل شدید دباؤ کے نتیجہ میں تسلیم کیا کہ ان کی ڈگری جعلی تھی۔

''بنوثابت کی مستحسن روایت''

سعودی حکام کی جانب سے جاری کردہ اعداد وشمار میں بتایا گیا ہے کہ گذشتہ برس کل ۹۰ ہزار ۹۸۳ شادیوں کا اندراج کیا گیا اور طلاق کے کل اٹھارہ ہزار سات سو پچاس معاملات درج ہوئے، طلاقوں کی اس کثرت کے اسباب کی نشان دہی کرتے ہوئے محمد العتیق نے اس کی اصل وجہ خطیر مہر کی رقم، لڑکی والوں کا لڑکے والوں پر بوجھ بن جانا، لڑکی کی آسائشوں کے بلند معیار کے لیے لڑکے والوں سے طرح طرح کے بے جا مطالبات اور داماد سے خدمت کی نامناسب توقع کو قرار دیا ہے۔ ایسے میں سعودی عرب کے جنوب میں واقع قبیلہ بنو ثابت کی روایت بڑی قابل قدر اور اہمیت کی حامل ہے۔ العربیہ کی رپورٹ کے مطابق تقریباً تین صدیوں سے اس قبیلہ میں مہر کے نام پر صرف دو ریال ادا کیے جاتے ہیں جسے خاص اصطلاح میں ''مذھّب'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، خواتین کم سے کم مہر پر فخر محسوس کرتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ پیسوں کے عوض انہیں خریدا نہیں گیا ہے بلکہ اسلامی روایات کے مطابق انہیں پورے عزت واحترام کے ساتھ رخصت کیا گیا ہے، اسلاف کی روایت کے مطابق اس پر ثابت قدمی متعدد عائلی ناچاقیوں سے نجات کا سبب ہوگی، دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سے انحراف اور مہر میں اضافہ کی مانگ کا کوئی واقعہ اب تک پیش نہیں آیا اور نہ ہی دس ہزار نفوس پر مشتمل اس قبیلہ میں طلاق کی کوئی اطلاع ہے۔ اب علماء اور سماجی مصلحین اس روایت کو پورے سعودی معاشرہ میں رائج وشائع کرنے کے لیے کمر بستہ ہیں۔

''ویراتھو اور اس کی تحریک ۹۶۹''

ویراتھو (Wirathu) میانمار کا بدھ بھکشو ہے، اس کی پیدائش ۱۹۶۸ء میں ہوئی، تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ بھکشو بن گیا لیکن وہ اپنی بدنفسی کو بدل نہ سکا، جاننے والوں کا کہنا ہے کہ اس کی طبیعت میں حرص وآز اور مسلمانوں سے نفرت وتعصب شامل ہے، قتل وغارت گری اور مسلم منافرت کے نتیجہ میں ۲۵ برس کی سزا بھی اس کو ملی تھی، مگر ۲۰۱۰ء میں عام معافی کے تحت اس کو رہائی مل گئی، باہر آکر اس نے پھر وہی نفرت انگیز مہم شروع کردی، اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے

قرآن کا مطالعہ کیا ہے اور بعض مسلمانوں سے اس کے تعلقات بھی ہیں لیکن اس کا کہنا ہے کہ بیشتر مسلمان میری عظمت کا احترام نہیں کرتے اور حفظ مراتب کا لحاظ کیے بغیر مجھ سے گفتگو کرتے ہیں، اسی وجہ سے مجھے ان سے سخت نفرت و عداوت ہے، ''۹۶۹'' نام سے اس نے ایک بڑی تحریک برپا کی، جس میں اپنے پیروکاروں کو تلقین کی کہ بدھ مت کی اشاعت کے لیے وہ خود کو وقف کردیں، تجارت صرف آپس میں کریں، مہاتما بدھ کے اوصاف کا آئینہ دار ہندسہ ۹ اور ان کی تعلیمات کی جانب اشارہ کرنے والے ہندسہ ۶ کو اپنے مکانات، دکانوں اور اداروں پر نقش کرائیں، اس تحریک سے بدھ مت کے پیروکاروں کے لیے الگ مذہبی اور نسلی ریاست کے قیام کا عندیہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ویراتھو کے اس نظریہ اور تحریک کو عام حمایت حاصل نہیں ہے، مینڈالائے کی میواڈی سایاڈ "Maawaddy Sayadaw" کے انچارج آریہ وٹھا بیونتھا "Abbot Arriya Wuttha Bewantha" نے اس کی توضیحات کو غلط اور اس کی ہدایات و تعلیمات کو بدھ مت کے منافی بتایا ہے۔

''روسومور یونس الونسو اور ان کے ترجمے''

روسومور یونس الونسو مقیم حال اسپین کی پیدائش ۱۹۶۸ء میں روم میں ہوئی، ۱۹۹۶ء میں دہلی یونیورسٹی سے موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۹۸ء میں وہ اسپین چلی گئی، ۲۰۰۴ء میں واپس آ کر پی ایچ یو میں تعلیم شروع کی، اطالوی، فرنچ، انگریزی کے علاوہ اردو اور فارسی زبانوں میں مہارت رکھتی ہے، ۲۰۱۰ء میں پروفیسر نیر مسعود کے سات اردو افسانوں کا ترجمہ ''عطر کافور'' کے نام سے اٹلانٹا نامی ادارے سے شائع کرایا، پھر سعادت حسن منٹو کے چودہ افسانوں کا مجموعہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نام سے کنٹراسنیا نامی ادارہ زار گوزا نے ۱۲ء میں شائع کیا، سال رواں کے آغاز میں مرزا محمد ہادی رسوا کے شاہکار ناول ''امراؤ جان ادا'' کی اشاعت البانے وارسلو سے کرائی۔ اس سے ایک بار پھر یہ مصرع اپنی معنویت کا اظہار کرتا نظر آتا ہے کہ ع

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے (اردو دنیا، نئی دہلی)

ک،ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

''اردو ادب میں علامہ شبلی کی خدمات''

عارف آشیانہ،
چوک، لکھنؤ-۳
۷/مئی ۲۰۱۳ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میری پی ایچ ڈی کے مقالہ کا عنوان تھا ''اردو ادب میں علامہ شبلی کی خدمات''، ۱۹۸۰ء میں یہ ڈگری مجھے میسر آئی تھی۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے ایک ایک لفظ دیکھ کر ۱۹۸۷ء میں اس پر مقدمہ تحریر فرمایا تھا۔ ۱۹۰۴ء میں مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب نے پیش لفظ کے طور پر طویل مضمون لکھ دیا تھا۔ پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے ممتحن کی حیثیت سے اپنی مفصل رپورٹ عنایت فرمائی تھی۔ اب تک اس کی طباعت کا بندوبست نہیں ہوسکا۔ ۳۳ برسوں کے بعد میں نے اس کی مکمل کمپوزنگ کرالی ہے۔ آگے کا مرحلہ دیکھیے کیسے طے ہوتا ہے۔ اب سوچنے لگا ہوں کہ زندگی میں یہ کام ہوجاتا تو اچھا تھا۔

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب کے نام جو کاغذات یہاں سے اعظم گڑھ کے پتے پر گئے ہیں وہ محفوظ ہوں گے۔ وہ تشریف لائیں گے تو انہیں مل جائیں گے۔ علی گڑھ کا پتہ بھی معلوم ہوجائے تو وہاں بھی رابطہ ہوسکتا ہے۔ مولانا رابع صاحب اس مرتبہ انہیں بھی دینی تعلیمی کونسل کا رکن نامزد کرنا چاہتے ہیں۔ میری بھی خواہش ہے کہ ان کی شمولیت ہوجائے۔

دینی تعلیمی کونسل کی تحریک، اس کی خدمات اور اس وقت اس کی افادیت پر آپ معارف میں کچھ لکھیں تو کیا کہنا۔ پیشگی شکریہ۔

والسلام احقر
مسعود الحسن عثمانی

''معارف کی ایک نعت''

پوسٹ بکس نمبر ۱۴
علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۲
۳/۶/۲۰۱۳ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اپریل کے ''معارف'' میں ص ۳۱۳ پر درج شدہ نظم، اس مصرع سے شروع ہوتی ہے:

''چل بسا دنیا سے اک تلمیذ رب مہرباں''

دنیا کے جو بڑے بڑے رائج جھوٹ ہیں ان میں سے یہ ''**الشعراء تلامیذ الرحمان**'' کا مقولہ بھی ہے۔ خدا جانے اہل علم کی عقل ایسے مقولوں کو پڑھتے اوران پر یقین کرتے وقت کہاں چلی جاتی ہے، انبیاء علیہم السلام کے سوا کوئی تلمیذ رب نہیں ہوتا، یہ خدا کی ذات پر اتہام ہے۔ خدا تو یہ کہتا ہے ''**الشعراء یتبعهم الغاوون**'' اور یہ علم وعقل کا دعوی کرنے والے ''**الشعراء تلامیذ الرحمن**'' کی رٹ لگاتے ہیں۔ کیا یہ خدا کی کھلی ہوئی بغاوت اور خدا کے کلام کا بالواسطہ یا بلاواسطہ انکار نہیں ہے؟

پھر یہاں جس شاعر کو ''تلمیذ رب مہرباں'' کہا گیا ہے، اس کے مجموعۂ کلام (قفس رنگ) کے ص ۱۱۲ اور ص ۱۱۴ پر ''منقبت'' اور ''سلام'' کے عنوان سے جو اشعار ہیں ان میں ''شرک جلی'' کے سوا کیا ہے؟

مئی کے شمارے میں ص ۳۹۳ پر جو نعت چھپی ہے اس کی بنیاد ''لولاک لما خلقت الافلاک'' کے من گھڑنت فرضی نظریے پر جو قرآن سے متصادم ہے۔ اس کو ''معارف'' میں چھاپنے کی بجائے آپ کو چاہیے تھا کہ شاعرہ کو خدا سے معافی مانگنے اور اپنے عقیدے کو درست کرنے کا مشورہ دیتے، ایک آدھ شعر کو چھوڑ کر باقی سب اشعار اہل غلو کے فرضی تصورات پر مبنی ہیں۔

اگر میں نے آپ کو ''قطعہ تاریخ وفات پروفیسر ولی الحق انصاری'' کبھی بھیجا ہے تو اس کے آخری شعر کو کاٹ کر اس طرح لکھ لیجیے:

سال فوتش نوشت کلک رئیس بی سرا شک ''تیز شد بہ بہشت''

(چالیس سال کی مدت میں یہ پہلا اتفاق ہے کہ کسی مادۂ تاریخ کے اعداد میں ایک عدد کا فرق ہوگیا اور شعر میں ترمیم کی ضرورت پیش آئی)

جویائے خیر

رئیس احمد نعمانی

باب التقریظ والانتقاد

احوال ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

ڈاکٹر محمود حسن الٰہ آبادی

احوال ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مقالات صدیقی (جلد اول) کا مفصل جائزہ:

از ڈاکٹر مقصود احمد صفحات: ۲۶۰، اشاعت: اگست ۲۰۰۵ء، قیمت: ۲۵۰ روپے، مصنف کا پتہ: ۲۰۳۔شفا کمپلکس، تاندل جا روڈ، وڑودرہ۔۳۹۰۰۲۰، ناشر: فلاح دارین ٹرسٹ، ڈی۔۱۸۸، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

لسانیات یا علم الالسنہ قدرے جدید علم ہے جس میں کسی زبان کی صوتیات، حرفیات اور ترکیبات پر جدید انداز سے گفتگو کی جاتی ہے۔ کسی بھی لفظ کی اصل کیا ہے اور ایک ہی لفظ مختلف زبانوں کی گردش میں کن کن تبدیلیوں سے دوچار رہا ہے، اس کا علم بھی لسانیات میں داخل ہے۔ یہ علم تعدد السنہ میں مہارت اور تاریخ الالسنہ پر مکمل دستگاہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ مغرب میں اس موضوع پر خاصہ کام ہوا ہے۔ اردو زبان میں املا کے جدید قواعد کی تدوین اور تلفظ میں جدید اصلاحات کی کوششیں اسی موضوع کے تحت ہوتی رہی ہیں۔ کسی بھی لفظ کی اصل کی تحقیق، اس کے املا اور تلفظ کی تجدید یا اصلاح پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اصلاح زبان کے ذیل میں اردو زبان میں سب سے پہلے مولوی عبدالحق اور مولوی وحیدالدین سلیم صاحبان نے قلم اٹھایا۔ زبان اردو کے قواعد صرف ونحو کی تدوین بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بیرونی الفاظ کی تہنید کے موضوع پر گہر افشانی کی ہے۔ اردو املا کی تشکیل جدید کے ذیل میں رشید حسن خاں صاحب کی تحقیقات کو بعض حلقوں میں قبول عام حاصل ہو چکا ہے۔ لیکن اس سلسلہ کی اہم ترین شخصیت وہ ہے جس کی تحریروں کو زیرنظر کتاب میں موضوع گفتگو بنایا گیا ہے یعنی جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم، جن کی لسانی تحقیقات کو عالمی پیمانے پر قبول عام حاصل ہوا ہے۔

بی-۱۰۴، بدر منزل، پٹیل نگر، وی پی ناکا، بھیونڈی۔

تنہا ایک زبان کی لسانیات پر گفتگو کرنا ایک تکنیکی بات ہے لیکن کسی لفظ کی اصل کا پتہ لگانا تعدد السنہ میں مہارت کا متقاضی ہے ۔ مصنف کتاب جناب ڈاکٹر مقصود صاحب نے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب (۱۸۸۵ء۔۱۹۷۲ء) کی جن زبانوں میں مہارت کا خصوصی ذکر کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) اردو ۔ (۲) عربی ۔ (۳) فارسی ۔ (۴) انگریزی ۔ (۵) ہندی ۔ (۶) جرمن ۔ (۷) سریانی ۔ (۸) قدیم فارسی ۔ (۹) ترکی ۔ (۱۰) عبرانی ۔ (۱۱) اوستا ۔ (۱۲) پہلوی ۔ (۱۳) جدید فارسی (۱۴) سنسکرت ۔ (۱۵) لاطینی ۔ (۱۶) یونانی ۔ مصنف کا قیاس ہے کہ زمانہ قیام بنگال میں مرحوم نے بنگالی ضرور سیکھ لی ہوگی ۔ اس ناچیز کا خیال ہے کہ جرمنی میں قیام کے دوران فرانسیسی زبان کا سیکھ لینا ان کے لیے مستبعد نہیں تھا اس لیے کہ انگلستان اور جرمنی کے درمیان فرانس کا واسطہ ہے ۔ مزید یہ کہ یوروپی زبانوں میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں فرانسیسی زبان کا شعبہ عرصہ سے قائم ہے ۔ اس طرح موصوف کی لسانی مہارت اٹھارہ زبانوں تک پہنچ جاتی ہے ۔ اس کثیر لسانی مہارت نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کو ایک عالمی پیمانے کے لسانی محقق کا درجہ عطا کر دیا ہے ۔ اسی لیے ان کے حوالے اکثر یورپی محققین بھی دیا کرتے ہیں ۔ مصنف نے اس ذیل میں جیفری کی خصوصی طور سے مثال دی ہے ۔ صدیقی صاحب نے **المعجم المفهرس لالفاظ الحديث** کی تیاری میں بھی حصہ لیا تھا ۔ ان کا نام اس اشاراتی معجم کے تیار کنندگان کی فہرست میں دیکھا جا سکتا ہے ۔ ان کے مقالات لیڈن سے شائع ہونے والی انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں بھی شامل ہیں ۔ مرحوم اٹھارہ سال تک جامعہ الٰہ آباد میں شعبہ عربی و فاسی کے صدر رہے ۔ ناچیز کے علم کے مطابق ان سے فیض حاصل کرنے والے ناموروں میں مولانا محمد علی نامی پروفیسر نعیم الرحمٰن اور استاذ نا العلام سید محمد رفیق وغیرہ ہیں ۔

افسوس کہ ایک زبردست علمی خزانہ کے امین ہونے کے باوجود بقول حضرت سید سلیمان ندویؒ، صدیقی صاحب اسے تقسیم کرنے میں بخیل واقع ہوئے تھے ۔ انہوں نے کوئی مستقل کتاب نہیں تصنیف فرمائی ، البتہ مختلف عنوانات پر ان کے مقالات ادبی اور تحقیقی رسالوں میں شائع ہوتے رہے تھے جنہیں ان کی وفات کے بعد ان کے لائق صاحب زادے جناب مسلم صدیقی مرحوم نے شائع کرنے کی کوشش کی تھی ۔ لیکن مصنف کی معلومات کے مطابق اس کی صرف جلد

اول ہی شائع ہوسکی ۔ زیرنظر کتاب اسی کے محتویات کے جائزے پر مشتمل ہے ۔ مسلم صاحب کی وفات کے بعد جلد دوم کے شائع ہوسکنے کی امید کم رہ گئی ہے ۔ اللہ کرے کہ اس کے شائع ہونے کی بھی کوئی سبیل پیدا ہو اور تشنگان علم کو سیرابی حاصل ہوجائے ۔

مصنف کتاب جناب ڈاکٹر مقصود احمد (صدر شعبہ عربی، فارسی، اردو بڑودہ یونیورسٹی) نے ''مقالات صدیقی'' کا دیدہ وری اور عرق ریزی سے مطالعہ کیا اور کہیں کہیں اپنی رائے کا بھی اضافہ کیا ہے ۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو لسانیات کا خصوصی ذوق ہے ۔ یہ اس لیے کہ کتاب کے بعض مباحث اتنے لطیف اور ادق ہیں کہ قدیم وجدید قواعد میں درک کے بغیر ان کا جائزہ نہیں لیا جاسکتا، کتاب کی صنفی تقسیم یوں کی جاسکتی ہے (۱) اردو صرف ونحو، (۲) اردو املا، (۳) الفاظ کی تراکیب (۴) عربی، فارسی اور اردو میں استعمال ہونے والے متعدد الفاظ کے اصل کی تحقیق، (۵) بعض مستعمل الفاظ کی خصوصی تحقیق، (۶) زبان کا فطری ارتقا، (۷) اصلاح سخن شاعری میں ۔

''زبان کے معیار'' کے بارے میں صدیقی صاحب کا کہنا ہے کہ ''زبان کے محققین اور بہ لحاظ معاشرت، اعلیٰ طبقے کے لوگ اور ایک حد تک متوسطین اہل زبان کہلا سکتے ہیں اور انہی کی زبان سند ہے'' ۔ انضباط صرف ونحو کے بارے میں ان کا فرمانا ہے کہ ''سماعت اور قیاس دونوں اس معاملے میں اہمیت رکھتے ہیں'' اور یہ کہ زبان کی وسعت یہ ہے کہ ہر خیال کے لیے ایسا لفظ یا کلمہ ہو جو مفہوم پر ٹھیک دلالت کرسکے اور الفاظ اور جملوں کی ترتیب ایسی متعین ہو کہ کلام ابہام اور مغالطے سے محفوظ رہ سکے ۔ پہلا امر زیادہ تر لغت سے متعلق ہے لیکن دوسرا امر بالکل صرف ونحو کے تحت ہے ۔

''اسم'' کے بارے میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اس کی دو حالتیں ہوسکتی ہیں: قائم اور محرف ۔ یہ تقسیم عربی کے مبنی اور معرب کے مماثل ہے ۔ اس طویل مضمون میں ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اردو زبان کے قائم اور محرف، واحد اور جمع کی اتنی مثالیں دی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے ۔ یہ مضمون پڑھنے سے ہی نہیں بلکہ یاد کرنے سے تعلق رکھتا ہے ۔ تبصرہ نگار کے خیال میں یہاں لفظی اور معنوی عوامل کی تفصیل میں مزید مثالوں کی ضرورت تھی ۔ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ اہل زبان شعوری یا غیر شعوری طور سے ان تمام اصولوں پر عمل پیرا ہیں ۔

''اصلاح سخن'' کے ذیل میں ڈاکٹر صاحب نے بعض اساتذہ کے اپنے تلامذہ کے کلام

پر اصلاح کے موضوع پر گفتگو فرمائی ہے۔شعر گوئی اور شعر فہمی کا تعلق شعری ذوق سے ہے اور یہ ذوق انفرادی ہوتا ہے۔مثال کے طور پر ڈاکٹر صاحب نے شوق سندیلوی کے اس شعر پر:

بوئے خونِ دلِ عاشق تو نہیں چھپ سکتی　　　گو بہت سہل ہے ہم رنگ حنا ہو جانا

پر اعتراض کیا ہے کہ بو اور رنگ باہم متغائر ہیں۔ان میں اتصال کا کوئی قرینہ ہونا چاہئے۔ناچیز کو اس سے اختلاف ہے کیونکہ یہی مغائرت تو اس کی اصل خوبی ہے۔دراصل اس مغایرت میں جدید لب ولہجہ کی خوبو پائی جاتی ہے۔

مذکورہ مضمون میں ''شکست ناروا'' یا ''مقطوع الوسط'' کی بحث بہت جاندار اور معلومات افزا ہے۔املا کے مسئلہ میں قاضی عبدالودود صاحب نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو اردو املا کے معاملہ میں اولیت کا اور اب تک حرف آخر کا درجہ حاصل ہے۔املا کے بارے میں رشید حسن خاں صاحب کی ان سے مراسلت رہی ہے اور دونوں بہت سے معاملات میں متفق الرائے ہیں۔اس ذیل میں فارسی سے درآئے الفاظ کے املا، دو مختلف زبانوں کے الفاظ سے مل کر اردو میں ایک لفظ بن جانے پر اس کا املا، بعض عربی الفاظ کے آخر سے ہمزہ کے ساقط کیے جانے کا مسئلہ، بعض قرآنی الفاظ کے معنی اور مفہوم کے تعین اور اردو میں ان کے لکھے جانے کا مسئلہ، ''ذ'' اور ''ز'' کے باہم تبادلے کا مسئلہ، ''ت'' اور ''ط'' کے استعمال کا مسئلہ، غرض کہ اس طرح کے بہت سے مسائل اس مضمون میں زیر گفتگو آئے ہیں۔صدیقی صاحب اور رشید صاحب دونوں نے دو مختلف زبانوں سے مرکب ایک لفظ کو الگ الگ لکھنے پر اصرار کیا ہے۔لیکن صدیقی صاحب متعدد جگہوں پر کہتے ہیں کہ اگر کسی لفظ کا کوئی املا عام طور سے مستعمل ہو تو اسے نہ بدلا جانا چاہیے۔یہ کم فہم اس موقع پر ''بلکہ'' کے مجوزہ املا ''بل کہ'' کے بارے میں عرض کرنا چاہے گا کہ اگر چہ ''بل'' عربی اور ''کہ'' فارسی کے الفاظ ہیں لیکن ''بلکہ'' خالص اردو کا لفظ بن گیا ہے، اس لیے ''بل'' اور ''کہ'' کو منفصل کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ایسے ہی اردو میں لفظ ''کہہ'' دو ''ہا'' سے لکھا جاتا ہے اسے مقصود صاحب نے ''ہائے واحد'' سے لکھ کر اس کے نیچے ہائے ہوز کی علامت کا اضافہ کیا ہے۔سوال یہ ہے کہ قدیم املا میں کیا عیب تھا جو ایک عجیب وغریب املا اختیار کیا گیا۔ایسے ہی اگر چہ اردو زبان میں تعلیل نہیں ہے لیکن پرانے لوگ جب دو ''یا'' کو متصل کرتے تھے تو پہلی ''یا'' کو ''ء'' سے

تبدیل کردیا کرتے تھے، جیسے ''روپیے'' کی جگہ ''روپئے'' لکھتے تھے۔ آخر اسے تعلیل کر کے ''روپے'' لکھنے کی کیا معقول دلیل ہے۔ جب عمومی مروج املا بھی ایک معیار ہے تو نیا املا اختیار کرنا ناچیز کے نزدیک ایک اضافی کام ہے۔ ایسے ہی ''شعراء'' اور ''ادباء'' جیسے عربی الفاظ میں آخر کے ''ء'' کو ساقط کرنے کے بارے میں اتفاق رائے مشکل ہے۔

املا کے ذیل میں جناب مقصود صاحب کا احساس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تصریح سے تین باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حرف ''ذ'' عربی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ یہ یونانی اور قدیم ایرانی زبانوں میں بھی موجود تھا۔ دوسرے یہ کہ ایرانیوں کی زبان میں بعد کو ''ذ'' تبدیل ہو کر ''د'' ہوگئی۔ تیسرے یہ کہ گنے چنے لفظوں میں جن کا ذکر وہاں اوپر آچکا تھا ''د'' کا حرف ''ز'' سے بدل گیا لیکن وہ الفاظ حسب عادت ''ذ'' ہی سے لکھے جاتے رہے۔

لفظ ''ہندوستان'' کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی تحقیق ہے کہ اصلاً یہ ''ہندستان'' ہے۔ ضرورت شعری نے اسے ''ہندوستان'' بنادیا ہے۔

صدیقی صاحب نے کلام حافظ میں جن معائب کی نشان دہی کی ہے ان میں سب سے اہم عیب ''تنافر'' ہے۔ تنافر یہ ہے کہ دو الگ الفاظ میں پہلے کے آخر میں جو حرف ہے وہی دوسرے لفظ کے اول میں ہو۔ اس سے شعر کی صحیح ادائیگی میں خلل واقع ہوتا ہے۔ ایسے ہی اضافت کو طول دینا کہ جس سے اضافت ''ے'' بن جائے بھی نقائص میں شامل ہے۔ یہ بھی منجملہ نقائص ہے کہ ''یائے وحدت'' کو گرادیا جائے۔ آخرالذکر کی مثال جیسے ع اے صبا ''نکہتے'' از خاک رہ بیار۔ یا ع ہر دم آید ''غمے'' از نو بہ مبارک بادم۔ لیکن اس اصول کے خلاف خود ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ ''ضمے'' کو کھینچ کر پورا حرف کر دینا نہ صرف جائز بلکہ زبان کی ضروریات میں سے ہے۔ ایسے ہی وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جب ''ہائے مختفی'' محض ایک حرکت ہو تو اسے ''الف'' یا ''ے'' کی طرح ادا کرنا نہ عیب ہے نہ ناجائز۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کا شمار الفاظ کے محققین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے عربی الفاظ کی تہنید کے اصول بھی منضبط کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کے ایک مقالہ ''بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق'' پر ڈاکٹر صاحب نے اظہار خیال فرمایا تھا۔ سید صاحب نے اپنے فضل اور علم و کمال کے

باوجود صدیقی صاحب کی تحقیقات پر اعتماد کیا ہے اور ان کے نقد کو قبول کیا ہے۔اس مضمون میں بہت سے ایسے الفاظ بھی زیر گفتگو آئے ہیں جن کے بارے میں یہی اختلاف ہے کہ وہ کس زبان سے آئے ہیں، جیسے مسالہ، کباب، سل وغیرہ۔ایک اور مضمون میں ''بغداذ'' کی وجہ تسمیہ پر کلام کیا گیا ہے۔ یہ مضمون طویل ہے لیکن اس کی لطیف تحقیقات لسانیات سے دلچسپی رکھنے والوں ہی کے لیے مخصوص ہیں۔

ولؔی کی زبان پر بعض حلقوں کی طرف سے جو اعتراضات سامنے آئے ان پر ڈاکٹر صاحب کا تاثر یہ ہے کہ ''زبان جوں جوں بدلتی جاتی ہے اس کی صحت اور فصاحت کے معیار میں تغیر ہوتا جاتا ہے۔اس لیے واجب ہے کہ جو نظم یا نثر ہمارے سامنے ہو ہم اسی زمانے کی زبان اور صحت و فصاحت کے معیار پر اسے جانچیں پرکھیں جس زمانے میں وہ نظم یا نثر وجود میں آئی ہو۔جو نقاد اس چودہویں صدی کی زبان کو بنا قرار دے کر بارہویں یا تیرہویں صدی کے شاعروں کی زبان کو غلط یا غیر فصیح کہہ بیٹھتے ہیں وہ ایسی بنیادی غلطی کرتے ہیں جس سے ان کی تحقیق کی دیوار ثریا تک ٹیڑھی چلی جاتی ہے''۔اس ذیل میں ڈاکٹر صاحب نے ایک پتہ کی بات اور لکھی ہے کہ ''چونکہ زبان کو املا کا درجہ حاصل نہیں ہوتا اس لیے اس پہلو سے کسی شاعر کی زبان پر اعتراض کرنا ایک (بے) معنی امر ہے''۔(تفہیم کی خاطر ''بے'' کا اضافہ مبصر کا ہے۔)

ڈاکٹر صاحب نے ''اردو میں ضمائر مفعولی'' کی تحقیق پر ایک مقالہ تحریر کیا ہے۔ یہ مقالہ بہت اہم اور قابل غور ہے کیونکہ اردو میں ''مفعول مطلق'' کے علاوہ جتنے مفاعیل ہیں وہ سب ''متعلقات فعل'' کہلاتے ہیں۔اس مقالہ میں صدیقی صاحب نے ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کے کچھ افکار پر اشکال کا اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا ایک مقالہ حرف ''ق'' پر بھی ہے۔جس کے مطابق فارسی معربات میں ''ق'' پر ختم ہونے والے الفاظ تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔اس کے بعد ''ج'' پر ختم ہونے والے لفظوں کی تعداد ہے۔اس مقالہ میں مختلف سامی اور آریائی زبانوں میں حرف ''ق'' کی موجودگی پر بحث کی گئی ہے جو لسانیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے۔

کتاب کا آخری مضمون ''وضع اصطلاحات'' پر مولانا وحید الدین سلیم کی تحریر پر تبصرہ

ہے۔ جس میں شامل اعتراضات کو مولانا مرحوم نے شکریہ کے ساتھ قبول فرمایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے مضمون میں اٹھارہ اصطلاحات پر گفتگو ہے۔ ایک لفظ ''بقرعید'' پر اظہار خیال مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ یہ لفظ دراصل ''بکراعید'' تھا جس میں سے بکرا کی ''الف'' حذف کرنے سے ''بکرعید'' ہوا۔ غالباً ادیبوں نے اسے ''بقرعید'' بنادیا۔ ناچیز کا اشکال یہ ہے کہ اگر قیاسات ہی پر بنا رکھنی ہے تو اسے ''بقرعید'' ہی کیوں نہ سمجھا جائے۔ بقرۃ کے نام سے تو قرآن میں ایک سورت بھی موجود ہے۔ ویسے قربانی ابل، غنم اور بقر تینوں کی ہوتی ہے اور سات حصے ہونے کی وجہ سے برصغیر میں مسلمان عموماً اسی بقر کی قربانی کرتے ہیں۔

مصنف کتاب نے اختتامیہ میں ڈاکٹر صاحب کی تحریر کی خوبیاں تجزیاتی انداز میں بیان کی ہیں، مثلاً یہ کہ ڈاکٹر صاحب ثقیل اور ادق الفاظ سے اپنی تحریر کو گرانبار نہیں کرتے تھے۔۔ ابہام، التباس اور اشتباہ اور غلط خواندگی سے بچنے کی خاطر اپنی عبارتوں میں اعراب اور علامات اوقاف کا باقاعدہ التزام فرماتے تھے۔ موصوف اپنی کوتاہی یا حقیقت تک نارسائی کے اعتراف میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اپنی لاعلمی کا علم ہونا بھی ایک علم ہے اور اس کا اعتراف کرنا عالی ظرفی اور بلند حوصلگی کی علامت ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ حسب ضرورت اپنی سابقہ تحریر سے رجوع بھی فرمالیا کرتے تھے جس کی وجہ سے کبھی کبھی ان کے یہاں اجتماع نقیضین بھی ملتا ہے جس کی طرف خود مصنف نے بھی کہیں کہیں اشارہ کیا ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے یہاں کہیں کہیں تکرار مطلب بھی پایا جاتا ہے۔ خود اس کتاب میں ''ہائے مختفی'' اور ''ذ'' کے بارے میں ایک سے زیادہ مقامات پر گفتگو کی گئی ہے۔ مصنف کی رائے میں ڈاکٹر صاحب طوالت پسند بھی تھے لیکن ناچیز مبصر کے نزدیک ان کی تحریروں میں اتنا تنوع ہوتا تھا کہ اس کی تفصیل ضروری ہوتی تھی۔

دقیق علمی مباحث بالخصوص لسانیات جیسے خشک موضوع سے شغف اور انہماک ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ فاضل مصنف (مقصود صاحب) کو اس کا ذوق تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ لفظ ''زندیق'' کی تحقیق پر خود ان کا ایک مقالہ ستمبر ۱۹۹۱ء کے ''معارف'' میں طبع ہو چکا ہے۔

کتاب کی خصوصیت دراصل اس کے حواشی ہیں۔ یوں تو کتاب کے تعارف و تجزیہ میں

مقصود صاحب کی بعض رائیں سامنے آتی ہیں لیکن حواشی میں وہ صرف کتابوں کے حوالے ہی نہیں دیتے بلکہ بعض قابل تحقیق تفصیل رتجزیوں پر بھی کلام کرتے ہیں۔ کتاب میں عربی، فارسی، اردو اورانگریزی زبانوں کی ٦٧ کتابوں یا رسائل کی فہرست منسلک ہے جن سے کتاب کی تیاری میں فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ناچیز کو بھی مصنف کی طرح علامہ رفیق مرحوم کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ بدقسمتی سے وہ موصوف کی طرح ان سے بوجوہ زیادہ استفادہ نہیں کر سکا۔ لیکن اپنے محدود علم کی بنا پر یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ اس کے زمانہ طالب علمی (۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۳ء) میں بھی جب کہ صدیقی صاحب حیات تھے، علامہ رفیق مرحوم کے علاوہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے تقریباً معدوم ہو چکے تھے۔ مقصود صاحب خوش قسمت ہیں کہ انہوں نے علامہ رفیقؒ کی رہنمائی مکمل طور سے قبول کی۔ اس کتاب کا انتساب بھی اسی لیے انہوں نے استاد محترم کے نام کیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم کی طرح مقصود صاحب بھی صحت زبان کے قائل ہیں۔ اسی لیے انہوں نے موضوع کی اہمیت کی وجہ سے آخر میں اغلاط کی ایک فہرست بھی منسلک کی ہے۔ یہ کام وہ اپنی ہر کتاب میں کیا کرتے ہیں۔ کتاب کو فلاح دارین ٹرسٹ، نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ پیپر باؤنڈ اچھے سفید دبیز پرنٹنگ پیپر پر مطبوع ۲۶۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت ۲۵۰ روپئے بہت مناسب ہے۔

رسالوں کے خاص نمبر

ماہنامہ تہذیب الاخلاق (چھ خصوصی اشاعتیں): مدیر ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، کاغذ و طباعت بہتر، مجموعی صفحات ۱۴۵۸، قیمت خصوصی شمارہ ۴۰ روپے، عام شمارہ ۱۰ روپے، قرآن نمبر ۳۰ روپے، مشاہیر نمبر ۵ عدد ۳۲۰ روپے، سالانہ زرتعاون ۱۰۰ روپے، پتہ: ایڈیٹر تہذیب الاخلاق ونشانت، ۱ شبلی روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲، یوپی۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی صالح، مفید اور زندہ روایات میں اس کے ترجمان رسالہ تہذیب الاخلاق کی ایک امتیازی شان ہے، مضامین کے تنوع اور معیار کی وجہ سے اس کو ہمیشہ قدر کی نظر سے دیکھا گیا، اس کی ایک خوبی اس کے خصوصی شمارے ہیں جو مختلف موضوعات پر بیش قیمت افکار و خیالات کا عمدہ اور جامع ذخیرہ پیش کرتے ہیں، ظاہر ہے فکر سرسید کی تشریح و

ترسیل اس رسالہ کا اہم مقصد ہے۔

ہمارے پیش نظر اس رسالہ کے کئی خاص شمارے ہیں جن میں اول ''قرآن نمبر'' ہے، فاضل مدیر نے شروع میں واضح کیا کہ سرسید، قرآن مجید کی تفسیر اس طرز پر کرنا چاہتے تھے کہ نئی نسل کی الجھنیں دور ہوسکیں، یہ بھی کہا گیا کہ ''فہم قرآن کے دائرہ کار کو بڑھانے میں سرسید کی خدمات ناقابل فراموش ہیں''، اس خاص اشاعت کا مقصد بھی فکر سرسید کی ترویج ہے، فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی تعلیمات، قرآنی مباحث، قرآن اور استشراق، قرآن مجید کے اسالیب، مطالعہ اور سائنس، مفسرین و مترجمین، تفاسیر و تراجم جیسے موضوعات پر تحریریں یکجا کی گئی ہیں، فارسی اور ہندی میں قرآنیات کے تعلق سے بھی مضامین ہیں، یعنی قریب تیس مضامین ہیں اور یہ شاید تیس پاروں کی مناسبت سے ہیں، لکھنے والوں میں پروفیسر شمیم جیراج پوری، پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، پروفیسر ظفر الاسلام، پروفیسر شکیل اوج، پروفیسر عبدالقادر جعفری، عبدالعلیم قدوائی، ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی، ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی کے علاوہ مولانا عنایت اللہ سبحانی، مولانا جرجیس کریمی، مولانا محمد اسلام عمری وغیرہ معروف علمائے قرآنیات شامل ہیں، خود فاضل مدیر کا مضمون قرآن کریم کا لسانی اعجاز کے عنوان سے ہے اور یہ سارے مضامین اس مقصد میں کامیاب ہیں کہ قرآن کریم ہر دور کے علمی اور معاشرتی تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور یہ کہ معاشرتی ارتقاء و تغیر خواہ کتنا ہی قدیم سے جدا اور جدیدیت کے رنگ میں ڈوبا ہو بہرحال قرآن مجید کا نیاپن باقی رہتا ہے اور بقا کی یہ تاثیر کبھی ختم نہ ہونے والی ہے، مفید مطلب مضامین کے اس گلشن میں ایک تحریر خار کی طرح کھٹکتی ہے، خیالات کیا ہیں اس سے قطع نظر اس تحریر کا اسلوب بھی عجیب ہے جس میں مسلمہ عقائد و نظریات اور اس سے بھی زیادہ حدیث کے بارے میں استخفاف صاف جھلکتا ہے جیسے ''آگے چل کر تو اسے (حدیث) وحی غیر متلو قرار دے کر قرآن کا ہم پلہ بھی بنانے کی کوشش کی گئی'' یا یہ کہ ''حضرت ابوہریرہؓ کی شخصیت متنازع رہی ہے''، اس مضمون میں ایسی نکتہ آفرینیوں کی نمائش ہے جن کو دیکھ کر مستشرقین بھی کف افسوس مل سکتے ہیں، یہ مضمون شاید اس لیے شامل کیا گیا کہ بقول مدیر ''تفسیر قرآن میں سرسید سے غلطیاں ہوئیں......احادیث کے سلسلے میں بے احتیاطیاں ہوئیں''، یہ بھی بتایا گیا کہ ''اسرائیلی روایات سے مملو تفاسیر اور ان کے تفسیری نہج کو سرسید نے ہدف

تنقید بنایا اور احادیث کو قرآن کریم پر حکم بنانے کی روایت پر تیشہ زنی کی''، مذکورہ مضمون کے بعد تدبر قرآن کے حجابات کے عنوان سے ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی کا ایک مضمون مع ترجمہ ڈاکٹر عبیداللہ فہد کے قلم سے ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''اگر قرآن کریم کا مطالعہ کرنے والے تنازعہ کے شکار ہوجائیں، ہر شخص اپنا موقف اختیار کرے اور حمایت میں قرآن سے استدلال کرنے لگے اور آیات کے اندر (دماغی) زور آزمائی کرنے لگے تو رسول اللہؐ ایسے لوگوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ قرآن کو چھوڑ دیں اور اس سے دست بردار ہوجائیں'' سرسید کا خط بنام نواب محسن الملک بالآخر یہی کہتا ہے کہ ''اسلام میں اور قرآن مجید میں کوئی بات مافوق عقل انسانی نہیں''۔

قرآن نمبر مئی ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا، سال ۲۰۱۳ء میں کمال یہ ہوا کہ فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون کے پانچ شمارے شائع ہوئے، ضخیم یعنی قریب تین تین صفحات کے، یہ مشاہیر علی گڑھ کے لیے وقف ہوئے، ان شماروں کو پیش کرتے ہوئے فاضل مدیر نے آغاز ہی اس جملے سے کیا کہ ''ادارہ سرسید کو جو امتیازات حاصل ہوئے ہیں وہ دنیا کے کسی دوسرے ادارے کے حصے میں نہیں''، یہی نہیں یہ دعویٰ بھی ہے کہ ''اس کے فارغین نے بحیثیت مادر علمی اس سے جس محبت اور عقیدت کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال دیگر اداروں کے فارغین کے یہاں مفقود و معدوم''، یہ دعویٰ یقیناً بربنائے محبت و عقیدت ہے، حالانکہ علی گڑھ ہی کے ایک اور موقر مجلّہ فکر و نظر نے اسی قسم کے پہلے بھی تین نمبر شائع کیے تھے لیکن خوب سے خوب تر کا سفر کہاں رکا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ پچھتر سے زیادہ ایسے فرزندان علی گڑھ کے حالات اور کارنامے ان نمبروں میں آگئے جو یقیناً مشاہیر کی فہرست میں داخل ہونے کے مستحق ہیں، کچھ کے بارے میں شاید مشاہیر کا لفظ منطبق نہ ہوتا ہو جیسے قاضی جلال الدین، پروفیسر محی الدین حاجنی، محمد نور نبی، پروفیسر شیخ عبدالرشید، خالد علیگ وغیرہ لیکن ان مرحومین کے کارنامے تب نہیں تو اب بہر حال ان کو مشاہیر کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں، اپریل کا شمارہ علی گڑھ کے مشاہیر کا تیسرا حصہ ہے، جس کے متعلق فاضل مدیر کا کہنا ہے کہ ''اس میں ہم نے سپوتان سرسید کی داستان لذت چھیڑی ہے جسے چکھنے کے بعد پارۂ اشتہا بے قابو ہوجاتا ہے'' شاید اسی جوش کا اثر ہے کہ انہوں نے مرحومین کے اس حصہ کو مشاہیر زندہ سے تعبیر کردیا، حالانکہ زندہ مشاہیر کے ''سلاسل زریں'' کو ''بضبط تحریر'' لانے کی سعی جون کے

شمارے میں شروع ہوئی، جس میں پہلا مضمون موجودہ شیخ الجامعہ ضمیر الدین شاہ پر ہے اور مدیر کے قلم سے ہے، اس کا آغاز بھی قیامت کا ہے یعنی ''حسن شاہ، رنگ اور قامت آسمانی سے ایک جوان رعنا کا تصور جاگے'' اختتام بھی ملاحظہ ہو'' پابندی وقت، نظم وضبط اور صحیح قیادت وسیادت ہی ان کا مقصود ومطلوب ہے، ویسے بھی آپ کا تعلق میرٹھ سے ہے جہاں سے جواں مردی اور پامردی مرتسم ہے''، مضامین اور مضامین نگار دونوں کی تفصیل کا یہ کالم متحمل نہیں لیکن بحیثیت مجموعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اتنے معلومات افزا، دلچسپ اور کارآمد مضامین کا یکجا کرنا بجائے خود ایک بڑا کارنامہ ہے، سوانحی ادب میں یہ شمارے اتنے اہم ہیں کہ ان سے خود علی گڑھ تحریک کی ایک تاریخ مرتب ہوسکتی ہے، اس کے لیے فاضل مدیر اوران کا ادارہ یقیناً قدر وتحسین وتبریک کا مستحق ہے۔

سہ ماہی فکرونظر (خصوصی اشاعت سیرت نگاری میں جدید رجحانات): مدیر ڈاکٹر محمد خالد مسعود، کاغذ وطباعت عمدہ، صفحات ۳۵۶، سالانہ زر اشتراک ۳۵۰ روپے، پتہ: ادارہ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد پاکستان۔

مستشرقین نے اسلام اور رسول پاکؐ پر الزام تراشیاں کرنے اور اسلام کو زک پہنچانے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، اس کے رد وابطال کے لیے اسلام کی صف سے مسلسل ایسے مردان کار نکلے جنھوں نے ان مستشرقین کی دسیسہ کاریوں کا بڑی خوبی سے ازالہ کردیا، اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ حیات طیبہ کے سیرت نگاروں نے سیرت نگاری میں مستند ومعتبر مآخذ ومصادر پر توجہ مرکوز کی، ایسی روایتیں جو محض واعظوں کی زبان پر تھیں اور جن کے انتخاب میں رطب ویابس کی معرفت پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی، ان سے اجتناب بلکہ ان کی حقیقت کے اظہار کی ایماندارانہ کوششیں ہوئیں اور سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ سیرت کے اولین اور حقیقی ماخذ یعنی قرآن مجید کو بنیادی طور پر پیش نظر رکھنے کا عمل شروع ہوا اور خود سیرت رسولؐ کے مطالعہ میں صحت واستناد اور سیرت نگاری کے مناہج واسالیب پر غور وفکر کا سلسلہ شروع ہوا جس کو فقہ السیرۃ کہا جانا بالکل درست ہے، پاکستان کے موقر مجلّہ فکر ونظر کا زیر نظر شمارہ اسی جدید سیرتی تقاضوں کا آئینہ دار ہے جس کا مرکزی موضوع ہی سیرت نگاری میں جدید رجحانات ہے، اس شمارے میں مقالات، نقد وتبصرہ اور کتابیات کے ابواب کے تحت کئی وقیع اور فکر انگیز تحریریں آگئی ہیں جیسے دور جدید میں

سیرت نگاری کے رجحانات، اردو سیرت نگاری کے مناہج واسالیب، غیر اسلامی ماخذ ومصادر میں مطالعہ سیرت، معجزات اور غیر مسلموں سے تعلقات وغیرہ، ڈاکٹر حافظ مبشر حسین کا مقالہ بڑا مبسوط ہے جس میں سیرت نگاری کے جدید رجحانات کی بحث میں علامہ شبلی اور ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری کے نظریات ومباحث کا ایک موازنہ بھی آ گیا ہے جس میں کہا گیا کہ یہ خیال درست نہیں کہ علامہ شبلی نے سیرت نگاری کے جو اصول مقرر کیے، سیرۃ النبیؐ میں ان کے اطلاق میں وہ خود داخلی تضاد کا شکار ہو گئے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ علامہ شبلی کے ہاں بعض اصول، تنقیح مزید کے محتاج رہ گئے، اس بحث میں واقدی ہی مرکزی موضوع ہیں اور ان ہی کے حوالے سے مضمون نگار کو یہ کہنا پڑا کہ ڈاکٹر عمری کے ہاں اصول سیرت زیادہ منقح شکل میں موجود ہیں، تنقیدیں ان دونوں کی ہوئیں لیکن دیکھا جائے تو یہ تنقیدیں اصول وضوابط کے انتخاب سے زیادہ ان کے اطلاقی پہلوؤں سے ہیں، مضامین سب سنجیدہ اور گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہیں، آخر میں عہد نبویؐ کے نظام سیاست کے عنوان سے مضامین کا ایک اشاریہ ہے اور یہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے بہت مفید ہے۔

ماہنامہ ندائے اعتدال (ادب اسلامی نمبر): مدیر ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی، کاغذ وطباعت بہتر، صفحات ۱۲۸، قیمت فی شمارہ ۲۰ روپے، سالانہ ۲۰۰ روپے، پتہ: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر-ڈی، جمال پور علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲۔

ندائے اعتدال مدرسۃ العلوم الاسلامیہ علی گڑھ کا ترجمان رسالہ ہے، کم عمری کے باوجود اپنے عمدہ مضامین وخیالات کی وجہ سے اس نے علمی ودینی حلقوں کو اپنی جانب متوجہ کرلیا ہے، اس کے حوصلہ مند مدیر اور سرپرستوں کی محنت وہمت کی وجہ سے اس کے کئی خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں۔

زیر نظر شمارہ ادب اسلامی نمبر ہے، ادب اسلامی کی صحیح جہت کا تعین اسی سے ظاہر ہے کہ ابتدا ہی میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تحریر بطور ایک کلید کے پیش کی گئی ہے ''ادب کی بڑی خاصیت اور قوت یہ ہے کہ وہ رجحانات اور میلانات، عمل، طرز فکر، اخلاق اور انقلابات کے محرکات پیدا کرتا ہے اس لیے وہ بہت مفید بھی ہوسکتا ہے اور بہت مضر بھی، ہر دور میں اس سے کام لیا گیا ہے اس کے تعمیری وتخریبی مظاہرے بھی ہمارے سامنے ہیں ......''۔ اسی روشنی میں

ادب اسلامی کے مختلف پہلوؤں جیسے قرآنی قصوں کا ادبی و تربیتی پہلو، ادب نبویؐ کا تربیتی پہلو، اسلامی ادب اور دیگر ادبی نظریے، ادب کے سلسلہ میں اسلامی مفہوم و موقف، مختلف ادوار میں ادب اسلامی کا تاریخی رول وغیرہ موضوعات پر ہندوستان کے ممتاز ادیبوں کے علاوہ عالم اسلام کے بھی مشاہیر ادباء کی بہترین تحریریں آگئی ہیں، لائق مدیر کی کئی عربی تحریروں کے ترجمے بھی ہیں لیکن سب سے زیادہ موثر ان کا اداریہ ہے جو اس موضوع پر ان کی فکروحمیت اور مثبت انداز نظر کا ترجمان ہے، ادب کے نام پر اردو دنیا میں جو بے ادبی روا رکھی گئی اس کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ اردو میں ادب اسلامی کا نظریہ موجود تو رہا لیکن اس کی وضاحت حسب ضرورت واہمیت نہیں کی گئی، جبکہ ادب اسلامی نہ کسی عہد کا ادب ہے اور نہ کسی خاص زاویہ کا، اس کی وسعتوں میں آفاق کی وسعتیں پنہاں ہیں۔ کاغذ طباعت اور تزئین کے لحاظ سے بھی یہ شمارہ قابل تعریف ہے۔

ماہنامہ نقوش اسلام (مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی نمبر): مدیر محمد مسعود عزیزی ندوی، کاغذ و طباعت بہتر، صفحات ۲۷۰، قیمت خصوصی شمارہ ۴۰ روپے، عام شمارہ ۱۵ روپے، سالانہ ۱۸۰ روپے، پتہ: ماہنامہ نقوش اسلام، مظفرآباد سہارن پور، ۲۴۷۱۲۹، یوپی۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مایہ ناز فرزند اور استاد مولانا عبداللہ حسنی ندوی کی وفات پر ان کا جیسا ماتم ہوا وہ ایک خاموش اور نام و نمود سے بیزار شخصیت کی ہر دل عزیزی اور عام دلوں میں ان کی محبت کی حیرت انگیز حقیقت ہے، رائے بریلی کے خانوادہ حسنی کے فرزند ہونے سے زیادہ ملت کے لیے ان کی جد وجہد اور ہر لمحہ دین کی سربلندی کی تڑپ ان کی زندگی کی پہچان بنی۔ نتیجتاً ان کی وفات ایک ناقابل تلافی نقصان وحرمان کی شکل میں محسوس کی گئی، زیر نظر شمارہ ان کی یادوں کے لیے خاص کیا گیا اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم عمری میں مولانا مرحوم نے کیسے کیسے بلند و رفیع مدارج طے کر لیے تھے، ان کا یہ جملہ بڑا معنی خیز ہے کہ ''آج کل دستار فضیلت تو رہ گئی لیکن دستار محبت غائب ہوگئی''، اسی طرح ان کا یہ مختصر قول بڑی بڑی تقریروں کا بدل ہے کہ ''آج ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے دو ہی چیزیں بچی ہیں ایک دعوت دوسرے دعا، یہ رسالہ صرف مولانا حسنی مرحوم کے حالات ہی نہیں ایسے احوال کا بھی ترجمان ہے جو قلب کی گرمی اور روح کی تڑپ کے ضامن ہیں۔

سہ روزہ دعوت (خصوصی اشاعت مسائل حاضرہ اور سیرت رسولؐ): مدیر پرواز رحمانی وشفیق الرحمٰن، کاغذ وطباعت مناسب، صفحات ۲۲۶، قیمت ۳۵ روپے، پتہ: دفتر دعوت، ڈی ۳۱۴، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر اوکھلا ئی دہلی-۲۵۔

مشہور اخبار سہ روزہ دعوت اپنی خصوصی اشاعتوں کے ذریعہ مسائل حاضرہ پر اہم مقالات ومضامین کے مجموعے پیش کرتا رہا ہے، زیرنظر شمارہ بھی مسائل حاضرہ اور سیرت رسولؐ کے اہم موضوع پر ہے۔

نبی کریمؐ کی سیرت کا یہ کمال ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کا عملی نمونہ آپ نے نہ پیش کیا ہو، اسی جامعیت وکاملیت نے صحابہ کرامؓ اوران کے بعد آنے والے تمام انسانوں کے لیے زندگی کے نت نئے مسائل سے عہدہ برآ ہونے اور مشکلات کا حل تلاش کرنے کا نسخہ کیمیا بخش دیا۔ موجودہ دور جیسے صرف مسائل بلکہ انسانی زندگی کے لیے مصائب کا دور ہے، معاش و معاشرت پر ایسے مسائل کی یلغار شاید ہی کبھی اس شکل میں رہی ہو کہ بنی نوع انسان کو اس نے نفسانی خواہشات کا اسیر بنا ڈالا ہو، روح اور جذبے جس دار ورسن میں پابند سلاسل ہیں، اس کو توڑنے اور انسان کو نفس کی غلامی سے رہا کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے جس کی رہنمائی حضور اکرمؐ کی سیرت پاکؐ سے ملتی ہے، مسلمان ہی اس سیرت کا عملی نمونہ بن کر دوسروں کے لیے قابل تقلید ہو سکتے ہیں لیکن وہ خود اس طرح نرغۂ شیطان میں ہیں کہ لوگ اب کسی فرد راہ داں کے لیے ترس رہے ہیں۔

زیرنظر شمارہ میں حجۃ الوداع کے خطبہ کی معنویت، معاشرتی اصلاح، خودکشی، دختر کشی، اسلامی سرمایہ کاری، اسوۂ رسول میں تجارت ومعیشت، صحت ومرض، میڈیا، ماحولیات، امن عالم، احترام انسانیت وغیرہ ایسے مضامین ہیں جو موجودہ مسائل کا بہترین حل پیش کرتے ہیں اور اس اعتماد سے پیش کرتے ہیں کہ مسلمان کوئی نسلی، علاقائی، تہذیبی اکائی نہیں بلکہ اصولی اور داعی امت ہیں۔ یہ شمارہ کسی درجہ اس دعویٰ کے اثبات میں کامیاب ہے کہ اسلام میں ہر مسئلہ کا حل موجود ہے۔

ت-ا، ندوی

ادبیات

حرف کشتگان

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

گہہ بہ دست رہزنان کشتہ شویم — گہہ بہ دست رہبران کشتہ شویم
گاہ در آسام و گہہ در ممبئی — بی خیال و بی گمان کشتہ شویم
گاہ در گجرات و در سورت گہی — زین کران تا آن کران کشتہ شویم
گاہ در دہلی ، گہی در دہرہ دون — گاہ در دیگر مکان کشتہ شویم
گہہ نوا کھالی ، گہی جمشید پور — ھم در این وھم در آن کشتہ شویم
در روڑ کیلا و در کلکتہ ھم — بی چنین و بی چنان کشتہ شویم
گہہ مراد آباد و در میرٹھ گہی — کودک و پیر و جوان کشتہ شویم
گاہ در ملیانہ ، گہہ ہاشم پورہ — سوختہ دل ، خستہ جان کشتہ شویم
گاہ بھاگل پور و گہہ در شاملی — در ہجوم طاغیان کشتہ شویم
گاہ در بھوپال و گہہ در آگرہ — از قضای ناگہان کشتہ شویم
در بنارس گاہ و گہہ در کانپور — بی ضمان و بی امان کشتہ شویم
در بھیونڈی گاہ و در بجنور گاہ — در بدایوں ہم چنان کشتہ شویم
در بریلی گاہ و گہہ در رام پور — بازنان و کود کان کشتہ شویم
در علی گڑہ ، گنج ڈندوارہ نگر — چونکہ ما مستضعفان کشتہ شویم
باز در گجرات حال ما ببین — چند گاہ و ہم چہ سان کشتہ شویم

پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴، علی گڑہ۔۲۰۲۰۰۲۔

گاہ در بازار ہا ، در راہ ہا	بی خبر از خان و مان کشتہ شویم
گاہ خفتہ اندرون خانہ ہا	وقت شبہا ناگہان کشتہ شویم
در مساجد وقت سجدہ در نماز	ناگہان تسبیح خوان کشتہ شویم
روزہ می گیریم و در زندان رویم	پس بغیر آب و نان کشتہ شویم
گاہ دست و پای ماپارہ کنند	گہہ بریدہ قیمہ سان کشتہ شویم
گہہ، چو، چوبِ خشک سوزانند مان	گہہ چو شمع بی زبان کشتہ شویم
وارہیم ام دست شہریہا اگر	باسلاح شرطیان کشتہ شویم
ہمچو مور زیر پا از سالہا	ہر زمان و ہر مکان کشتہ شویم
مختصر این است ، بی جرم و خطا	ما در این ہندوستان کشتہ شویم
از چہ کس خواہیم داد خون خویش	چوں بہ امر حاکمان کشتہ شویم

ای خدای اہل ایمان ، تابہ کی
ما بہ دست کافران کشتہ شویم؟

زرتعاون میں اضافہ

معارف کے زرسالانہ میں اضافہ کیا جارہا ہے، اب یہ سالانہ ۲۸۰ روپے اور ماہانہ ۲۵ روپے ہوگا۔ پانچ سال کا یکمشت چندہ ۱۳۰۰ روپے ہے۔

مطبوعات جدیدہ

دیوان زادہ شیخ ظہور الدین حاتم: از پروفیسر عبدالحق، قدرے بڑی تقطیع، اعلیٰ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۶۴، قیمت: ۲۵۰ روپے، پتہ: دلی کتاب گھر، ۳۹۶۱، گلی خان خاناں، جامع مسجد، دہلی-۶۔

اردو شاعری کا یہ امتیاز کم لائق شکر و رشک نہیں کہ شمالی ہند کے پہلے صاحب دیوان شاعر حاتم ہیں، خدا مست وخود آگاہ، ایسا شاعر جس نے اٹھارہویں صدی یعنی آج سے قریب تین سو سال پہلے اپنے کلام سے اردو شاعری کے خمیر میں انسان اور انسانی زندگی کے تمام رنگ شامل کر دیے، جس نے مزا جینے کا مر جانے میں دیکھا، جس کے سامنے یہ حقیقت تھی کہ

ہے آزادوں کے گر رہنے کو بس تکیہ فقیروں کا

جس میں یہ حوصلہ تھا کہ ع نکل کے قید سے ٹک دید کر خدائی کا

جس کو یہ احساس تھا کہ ع دیکھو حاتم نے کہ اب فیض سخن عام کیا

اس فیض سخن کے کلام کرنے میں کیا کیا نہ گزری

گلایا آپ کو حاتم نے سر سے پاؤں تک تجھ بن
رگ اپنا، گوشت اپنا، پوست اپنا، استخوان اپنا

ایسے باکمال شاعر کی قبولیت ہی کہی جائے گی کہ ان کے کلام کی حفاظت واشاعت کی خدمت ایسی ہستی کے حصے میں آئی جس کی شناخت ادب عالی سے اخلاص کے تعلق کی ہے بقول حاتم

گل سے رکھتی ہے جوں صبا اخلاص

ایک غزل میں حاتم نے کہا تھا کہ میرا دل تو بحر معانی کا غواص ہے اب ان سے در سخن وہی لے جس میں اخلاص ہو صدیوں پہلے انہوں نے ایسے قدرداں کی آرزو کی تھی جو

تمام ہند میں دیوان کو ترے حاتم
رکھے ہے جان سے اپنی عزیز عام اور خاص

زیرنظر دیوان زادہ کے ذریعہ فاضل محقق و مدون نے اس آرزو کو جو معنویت بخشی وہ واقعی پاک اور سچی شاعری کی کرامت ہی ہے۔ چند سال پہلے فاضل مصنف نے حاتم کے دیوان قدیم کا ایک انتخاب دیوان حاتم کے نام سے شائع کیا تھا، جو ان کو ایک مخطوطہ کی شکل میں حاصل ہوا تھا اور جس کے متعلق انہوں نے لکھا تھا کہ ''یہ دولت گم گشتہ اپنی گراں مائیگی میں گنج گہر سے کم نہیں ہے'' اسی کے ساتھ انہوں نے یہ مژدہ بھی سنایا تھا کہ ''دیوان زادہ بھی تقریباً مرتب کر چکا ہوں ......کلاسیکی ادب کے مطالعہ میں دیوان زادہ ناگزیر اہمیت کا حامل ہے'' اب یہی دیوان زادہ مکمل صورت میں پیش کیا گیا، ایسا نہیں ہے کہ دیوان زادہ کی یہ پہلی اشاعت ہو لیکن دیوان حاتم کے قریب سات نسخوں اور خود فاضل مرتب کو حاصل ہوئے نایاب نسخہ کے تقابلی مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ خاصا غیر مطبوعہ کلام ہے جس کی وجہ سے مرتب کردہ کلام میں اضافے کی گنجائش ہے۔ اس طرح زیرنظر دیوان زادہ بہتر اور کامل ترین بن کر سامنے آیا، مخطوطات کی ترتیب و تدوین اور مختلف نسخوں کی روشنی میں تصحیح و تکمیل، محنت طلب ہونے کے ساتھ بڑا صبر آزما عمل ہے، فاضل مرتب کی شہرت نقاد اور چلے ہوئے لفظ میں تخلیقی ادیب و انشاپرداز کی ہے، اقبال و اقبالیات سے ان کی وابستگی مطالعاتی سے کہیں زیادہ جذباتی کہی جاتی ہے، اس کے باوجود متن کی تدوین، مراجعت اور پھر تعلیق و تخریج کے ہر معیار پر جس طرح یہ دیوان زادہ مرتب ہوا ہے وہ دوسرے محققوں اور مخطوطات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک مثال ہے، قابل تقلید مثال۔ کلام حاتم کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کا مفصل و مبسوط مقدمہ بجائے خود حاتم کی شاعری کی طرح جلوہ صدرنگ لیے ہوئے ہے جس میں حاتم کی شخصیت، ان کا عصر و ماحول، ان کے دیوان کے مختلف مخطوطات، نقادوں کے خیالات، ان کی شاعری کے اوصاف و کمالات، اردو کی ابتداء و ارتقاء، لسانی و معاشرتی تاریخ پر اس طرح روشنی بکھیری گئی ہے کہ ہر گوشہ منور اور واضح تر ہو گیا، دور حاتم کے لسانی تغیرات کی بحث میں کہا گیا کہ ''اس کی روشنی میں بڑی شد و مد سے پیش کیا جانے والا امیر خسرو کا ہندوی کلام ایک واہمہ اور مفروضہ بلکہ فریب نظر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، اگر عہد حاتم کے ایک مختصر وقفے میں زبان ترقی کر کے اتنی صاف ستھری ہو سکتی ہے تو خسرو سے حاتم کے درمیان چار سو سال کی مدت میں زبان میں ٹھہراؤ یا جمود کیوں تھا؟ ...... خالق باری ہو یا چہار

درویش یا وہ مشہور غزل ''زحال مسکیں'' سب کے سب امیر خسرو سے کوئی نسبت نہیں رکھتے''، اس قسم کے بے شمار نکتے دوران بحث قاری کے لیے ہر لمحہ دانش و بینش کی عطا بن جاتے ہیں، مخطوطات دیوان حاتم کا ذکر ظاہر ہے تفصیل سے ہے لیکن یہ بات شاید رہ گئی کہ دیوان زادہ کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ بہر حال یہ کلام حاتم اور پیام حق کی برکت ہے کہ حکومت ہند کے نیشنل مشن فار منواسکرپٹس کے ادارہ پرکاشکا کو اپنی پہلی اشاعت کے فخر و اعزاز کے لیے دیوان زادہ کی دولت ملی، اس حسن انتخاب اور حسن اعتراف کے لیے پرکاشکا اور اس کے جنرل اڈیٹر دپتی ایس ترپاٹھی بھی لائق تحسین ہیں۔

کتاب الٰہی کے پانچ مطالبات: از ڈاکٹر فضل الرحمٰن گنوری مرحوم، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۱۲۰، قیمت درج نہیں، پتہ: حکمت قرآن انسٹی ٹیوٹ، کراچی پاکستان۔

قرآن مجید کے فضائل و محاسن کا شمار کون کر سکتا ہے لیکن خود قرآن کریم کی یہ آیت کہ **وقال الرسول یا رب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا** ''رسول کہیں گے کہ اے میرے رب میری قوم نے اس قرآن کو نظر انداز کر رکھا تھا'' قرآن کی عظمت و اہمیت کے علاوہ اس کی ضرورت پر سب سے زیادہ پر اثر ہے، اسی اثر کا ایک نتیجہ زیر نظر مختصر لیکن بہت مفید کتاب ہے، مصنف کو یقین ہے کہ قرآن کریم کو ترک کرنے اور چھوڑ دینے کا رویہ ہی انسان پر ہدایت کے سارے دروازوں کے بند ہونے کا باعث ہوتا ہے، اس گمرہی سے بچنے کے لیے انہوں نے بڑی سادگی سے یہ سمجھایا کہ قرآن کریم کے انسان سے پانچ مطالبے ہیں، ایک تو ایمان بالقرآن اور پھر تلاوت، تدبر، عمل اور تبلیغ، ان پانچوں مطالبوں کو اس کتاب میں بڑی دلسوزی سے پیش کیا گیا، تلاوت کے باب میں کہا گیا کہ اس یقین کے ساتھ کہ قرآن مجید کا ایک ایک حرف اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس کی تلاوت ایک نرالی نفسیاتی کیفیت اور روحانی فیض کا دروازہ کھولتی ہے، یہ کہنا کہ بغیر سمجھے پڑھنا فائدہ مند نہیں، تعلق باللہ کے اس بے بدل ذریعہ سے محروم کر دینا ہے اور یہ ظلم ہے، الفاظ قرآنی کی تلاوت سے بے اعتنائی، قرآن کے مطالبہ سے فرار ہے، یہ کہنا بھی بالکل صحیح ہے کہ بچپن میں قرآن کی حرف شناسی سے محروم بعد میں بھی اس سے تمام تر محروم ہی رہتے ہیں،

تلاوت ہوگی تو تدبر کے امکانات بھی روشن ہوں گے، تدبر قرآن کے سلسلے میں ایک مغالطہ بھی عام ہے کہ قرآن کو سمجھ کر پڑھنے سے اختلافات ذہن میں راہ بنا لیتے ہیں، جب کہ حقیقت واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے اصلاً تفکر و تدبر کے کچھ اصول ہیں، وہ پیش نظر رہیں تو یہ مغالطہ خود بخود دور ہوجاتا ہے۔ اس کتاب کے مضامین کبھی رسالہ احتساب میں شائع ہوئے تھے، اب خوب ہوا کہ یہ عام فہم اور دلنشیں مضامین زیادہ محفوظ و موثر ہوکر کتاب کی شکل میں آگئے، یہ کتاب قریب ایک سال پہلے آئی تھی، افسوس ہے کہ مصنف چند ہفتے قبل اس دنیا سے رخصت ہوگئے، وہ علی گڑھ کے شعبہ دینیات سے عرصے تک وابستہ رہے، سعودی عرب اور ملیشیا میں بھی رہے، آخر میں پاکستان چلے گئے، قرآن مجید سے تعلق اور اس کی تعلیمات کے فروغ میں ان کی فکر و ہمت کی شہادت یہ کتاب ہے اور یقین ہے کہ اس علمی صدقہ جاریہ کی برکتیں، ان کے لیے رضائے الٰہی کی صورت میں سب سے عمدہ اجر و انعام کا ذریعہ ثابت ہوں گی۔

مئو، شہر ہنروراں: از ڈاکٹر شکیل احمد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۵۶، قیمت: ۲۲۰ روپے، پتہ: ڈاکٹر شکیل احمد، قاسمی منزل، ڈومن پورہ، مئوناتھ بھنجن اور فہیم بک ڈپو، صدر چوک مئوناتھ بھنجن اور حیدرآباد، لکھنؤ، سری نگر اور دہلی کے مشہور مکتبے۔

کبھی اعظم گڑھ کا ایک حصہ اور اب اپنی جدا شناخت کے ساتھ اس کے جوار کا حق رکھنے والا مئو کا شہر اور ضلع اپنے خصائص اور امتیازات کے سبب کسی رسمی تعارف کا محتاج نہیں، قابل فخر تاریخ اور تہذیب دونوں اس کے دامن میں ہیں، سالار مسعود غازی، ملک طاہر، ملک قاسم، شیر شاہ اور جہاں آرا، وقت کے ساتھ یہ نقوش ابھرتے رہے، معیشت میں پارچہ بافی کی صنعت نے اس کو ہمیشہ خلعت امتیاز سے نوازا لیکن اس کی اصل دولت دین و مذہب سے وابستگی اور علم و ادب سے شیفتگی ہے، دینی تعلیم کے اتنے معیاری مراکز شاید ہی کسی اور شہر میں ہوں اور سب سے بڑھ کر شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی جیسے محدث کبیر و شہیر کے وجود مسعود نے اس خطہ کو جیسے بخارا و نیشاپور کی صف میں جگہ عطا کردی۔ مولانا عزیز الرحمٰن، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مولانا مختار احمد ندوی، مولانا مقتدی حسن ازہری جیسے علماء و فضلاء اور فضا ابن فیضی، اثر انصاری جیسی نامور شخصیتیں اسی مئو کی خاک سے اٹھیں اور شہرت کے آسمان پر چھا گئیں، خود

اس کتاب کے لائق مصنف مئو کی تابندہ روایتوں کو زندہ رکھنے والوں میں شامل ہیں، انہوں نے نہایت سلیقے سے اس شہر ہنروراں کے ماضی اور حال کے ہر نقش کو اس کتاب میں اس طرح ثبت کر دیا کہ محلے، تجارتی اور مذہبی وسماجی، ادبی وشعری سرگرمیاں، تعلیمی صورت حال، کتب خانے، قدیم وجدید آثار وعمارتیں، خورد ونوش، رسم ورواج، لباس، زبان اور تذکرہ وتاریخ کے لطف کے ساتھ ایک دستاویزی شکل میں سامنے آ گئے۔

اسلامی افسانوی ادب: تعلیق وترجمہ ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۱۶، قیمت: ۱۴۰ روپے، پتہ: دار الکتاب، دودھ پور علی گڑھ اور جامعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔

افسانہ ادب کی مقبول صنف ہے، اس پر عام طور پر ادب والوں کا اتفاق ہے، لیکن ادب کی پاکیزہ اور اعلیٰ اقدار کا افسانہ نمایندہ ہے اس پر کچھ کا اختلاف بھی ہے، اس کی ایک وجہ تو غالباً یہی ہے کہ کم از کم اردو میں افسانہ، مغربی ادب کا شاخسانہ ہے ہیئت اور بعض بنیادی عناصر کے لحاظ سے اردو افسانہ میں مغربی اثرات صاف دیکھے جاسکتے ہیں، تاہم افسانہ کا مقصد یعنی زندگی کا ایک فکر انگیز فلسفہ اور ایک مخصوص نقطۂ نگاہ سامنے ہو تو اس سے مطلق کنارہ کشی بھی ضروری نہیں، ایک دور تھا جب نذیر، شرر اور راشد الخیری جیسے افسانہ نگاروں نے افسانہ کی مقصدیت پیش نظر رکھی، مذہب، اخلاق اور معاشرہ میں پاکیزہ اقدار کے فروغ میں ان کے اور ان جیسوں کے افسانے کامیاب بھی ہوئے لیکن یہ سلسلہ جیسا چاہیے تھا، جاری نہ رہ سکا اور بعض اشتہاری نظریات کی وجہ سے افسانہ معیوب اور متروک بھی گردانا گیا، زیر نظر کتاب اصلاً ایک عربی ادیب وناقد ڈاکٹر مامون فریز جرار کی ہے اور قدرتاً عربی کے افسانوی ادب پر محیط ہے جس میں اسلامی افسانوی ادب کی خصوصیات و مقاصد پر قرآنی اور حدیثی قصوں کے ادبی، فنی، مکالماتی خوبیوں کو پیش کر کے دکھایا گیا کہ اسلامی افسانوی ادب پر قرآنی قصوں کے کیسے خوبصورت اثرات مرتب ہوئے یا ہو سکتے ہیں، سماجی قدروں اور انسانی زندگی کی تعمیر وتحسین وترتیب میں ادب کی یہ صنف اس لائق ہے کہ اس کا بہتر سے بہتر استعمال کیا جائے، فاضل مترجم نے اسی مقصد سے اس مفید اور شاید اب تک منفرد کتاب کو اردو میں منتقل کیا اور چونکہ وہ محض ناقل نہیں اس لیے اپنے پیش لفظ میں مدلل اور سلیقہ سے اسلامی افسانوی

ادب کی ضرورت اور ادب اسلامی میں فنی اصولوں کو برتنے کی جانب توجہ دلائی، ان کا یہ احساس بالکل درست ہے کہ ادب اسلامی کا دائرہ تمام وسعتوں سے وسیع تر ہے اس لیے کوئی وقتی، نظریاتی اور فلسفیانہ قید اس کو محدود نہیں کرسکتی۔ پروفیسر سید احتشام کا یہ تاثر بھی برحق ہے کہ یہ کتاب اسلامی ادب کے نام لیواؤں کو جھنجھوڑتی ہے کہ وہ افسانوی ادب میں اپنی کاوشوں کا جائزہ لیں۔

حرف آرزو: از جناب وارث ریاضی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۲۴، قیمت: ۲۵۰ روپے، پتہ: کاشانۂ ادب، سکٹا (دیوراج) پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن بہار، ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ کے علاوہ مکتبہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔

تو اول ہے تو آخر ہے تو ظاہر ہے تو باطن ہے مگر پھر بھی عیاں ہوتا نہیں راز نہاں تیرا

جیسا حمد یہ شعر کہہ کر اسی حمد میں شاعر نے اس طرح اپنی عبودیت کا اظہار کیا کہ

ترا وارث حسن ہے مبتلائے گردش دوراں کہ یارب امتحاں در امتحاں ہے امتحاں تیرا

وارث حسن ریاضی کی شعری ریاضت سے معارف کے قارئین سے بڑھ کر کون واقف ہوسکتا ہے، وہ حقیقتاً شاعر معارف ہیں، شعر گوئی ان کے لیے محض شوق یا فن کا حصول نہیں، یہ ستاروں کا سفر اور تلاش خوب تر اور صدائے دربہ در ہے، مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کو ہم نے ان کی پاکیزہ گوئی کی داد دیتے ہوئے بارہا دیکھا، پروفیسر نذیر احمد نے ان کی کہنہ مشقی کا اعتراف کیا اور اب زیرنظر مجموعہ کلام کا ہر شعر ان کے تخیل کی رفعت ان کی فکر کی طہارت اور ان کی سخن سنجی کی نظافت کی دلیل ہے، حمد ونعت کے علاوہ نظمیں ہیں، مرثیے ہیں، رباعیات ہیں لیکن زیادہ حصہ غزلوں کا ہے، پسندیدگی اور داد کے لیے اپنا اپنا ذوق ہے، ہماری نظر میں تو ہر شعر پراثر ہے، شعر کی کامیابی کے لیے اثر کی قوت ہی کافی ہے باقی فنی محاسن کے لحاظ سے جیسے نئی اور خوبصورت ترکیبوں کی ایجاد اور تراش خراش اور بقول استاذ سخن ناوک حمزہ پوری، شاعر کی پرگوئی اور ہمہ جہت قادرالکلامی سے یہ مجموعہ واقعی داد کے قابل ہے، دل کی زندگی اور جذبوں کی پاکیزگی کی افزود کے لیے شاعری اگر ایک محرک ہے تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ حرف آرزو بھی اس میں شامل ہے، پروفیسر نذیر احمد، سید امین اشرف اور ناوک حمزہ پوری کی تحریریں اس مجموعہ کی وقعت وافادیت میں اور اضافہ کرتی ہیں۔

ع-ص

رسید کتب

۱-**اردو سفرناموں کا تنقیدی جائزہ:** خالد محمود، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ قیمت:۱۰۸روپے

۲-**انوار ساطعہ در بیان مولود فاتحہ:** مولانا محمد عبدالسمیع سہارن پوری، تخریج محمد افروز قادری چریا کوٹی، رضوی کتاب گھر، دہلی۔ قیمت درج نہیں

۳-**بعد از خدا......:** انور جلال پوری، اقرأ کمپیوٹر سنٹر ۱۳/سی کاٹجو روڈ، الٰہ آباد۔ قیمت:۲۰۰روپے

۴-**توشۂ آخرت (منظوم پارۂ عمّ):** انور جلال پوری، انور جلال پوری، فلیٹ نمبر A-107 ایف آئی، ڈھینگرا اپارٹمنٹ، لال کنواں، لکھنؤ یوپی، انڈیا۔ قیمت:۱۰۰روپے

۵-**حمید الدین فراہی کی فارسی شاعری کا تنقیدی تجزیہ:** ڈاکٹر شاہد نوخیز، الانصار پبلی کیشنز، ریاست نگر، حیدرآباد۔ قیمت:۹۴روپے

۶-**راہرو سے رہ نما تک، سیرت خلفائے راشدین (منظوم):** انور جلال پوری، پتہ نمبر ۴ ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت:۱۸۰روپے

۷-**سراج العوارف فی الوصایا والمعارف:** سید شاہ ابوالحسین احمد نوری، رضا اکیڈمی ۵۲/ڈونٹا اسٹریٹ، کھڑک، ممبئی-۹۔ قیمت درج نہیں

۸-**شگفتگی دل کی (خاکے اور انشائیے):** خالد محمود، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ قیمت:۶۸روپے

۹-**کالا پانی (گم نام مجاہدین جنگ آزادی):** وسیم احمد سعید، مولانا آزاد اکیڈمی، N-80/، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔ قیمت:۳۰۰روپے

۱۰-**کلیات اختر مسلمی:** فہیم احمد، فضل الرحمٰن مسلمی، مسجد جدید، سرائے میر اعظم گڑھ، یوپی۔ قیمت:۳۰۰روپے